جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

اکتوبر ۱۹۹۵

مدیر: خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۱ | اکتوبر ۱۹۹۵ء جمادی الاول ۱۴۱۶ھ | عدد ۱۰

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۵۷۰۱۴۴

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۲ روپے

زر سالانہ -/۱۲۰ روپے

مشرق وسطی -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط -/۳۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

○

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

وہ آنکھوں میں خاک جھونکتے ہیں، عقل پر پتھر مارتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ کسی کالے کو گورا بنانا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ کسی ہندو کو عیسائی بنانا۔ کالی کھال کو کس نے اجلا کیا؟ اور کر سکتا ہے؟ لیکن ہندوؤں کو عیسائی یا عیسائیوں کو مسلمان ہوتے ہوئے کس نے نہیں دیکھا؟ اور کون نہیں دیکھ رہا ہے؟ تورانی نسل کے آدمی کو آریوں کے خون میں کون شریک کر سکتا ہے؟ لیکن رومن کیتھولک کی کتنی آبادیاں تھیں جہاں اب صرف پروٹسٹنٹ آباد ہیں۔ بہرحال قوموں کو ایک مذہب سے علیحدہ ہو کر دوسرے مذہب کی تعلیمات قبول کرتے ہوئے کب نہیں دیکھا گیا اور کہاں نہیں دیکھا جا رہا ہے؟ لیکن چینی بولنے والی قوموں کو بنگالی زبان کے بولنے پر آمادہ ہوتے ہوئے کبھی سنا گیا؟ یا کہیں مشاہدہ کیا گیا؟ افراد کی زبانیں بدلتی رہتی ہیں، اور بدلی جا سکتی ہیں، لیکن قوموں کی زبانوں کا بدلنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنا۔ پانی کی طرح، تقریباً نصف صدی سے دیکھو کہ، آدمی کی کمائی ہوئی دولت صرف اس غرض سے ہندستان میں بے دردی کے ساتھ بہائی جا رہی ہے کہ جن ہندستانیوں کی زبان ہندستانی (اردو) ہے وہ انگلستانی بولی بولنے لگیں۔ کوئی دقیقہ ہے جو اس کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے؟ عمارتوں کا دھوکہ دیا جاتا ہے، فرنیچروں کا مغالطہ پھیلایا جا رہا ہے، ہر ہر صوبے میں کتب خانوں کو فلک نما ایوانوں اور مدرسوں کو سپہر پیما دیوانوں کی شکل تک ترقی دی گئی ہے، اور دی جا رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ قانون بھی ملک کے طول و عرض میں نافذ کیا گیا ہے کہ رزق کے وہ سارے دروازے جسے حکومت نے کھولا ہے ان پر قطعاً بند کر دیے گئے جو انگریزی نہیں جانتے۔ عزت کی کرسیوں سے ہندستان میں وہ محروم کیے جاتے ہیں جو جزائر برطانیہ کی زبان سے جاہل ہیں۔ اخباروں، رسالوں، کانفرنسوں اور لیڈروں، خطیبوں اور مقرروں، سب کے اندر سے یہی آواز پیدا کی جا رہی ہے، کہ زندگی صرف ان کے لیے ہے، جو انگریزی جانتے ہیں۔ موت کا انتظار وہ کریں جو اس زبان سے اب تک بیگانہ ہیں، اوپر نیچے، چپ و راست، آگے پیچھے، جدھر نظر اٹھاؤ، صرف انگریزی کے حروف، انگریزی کے بورڈ، انگریزی کے ٹکٹ الغرض آسمان بھی انگریزی بنایا گیا ہے، اور زمین بھی انگریزی ہی میں غرق ہے۔ لیکن کاوش کی ان سرگرمیوں، اور کوشش کی ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد نتیجہ کیا ہے؟ ملک کے دس فی صد باشندوں نے ابھی صرف انگریزی سیکھی ہے، اور اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر اس کو اپنی زبان نہیں بنایا ہے۔ (مناظر احسن گیلانی، جلد ۷، عدد ۱، اکتوبر ۱۹۳۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

بوسنیا کا سبق

خرم مراد

بوسنیا کا نام و نشان مٹانے کی جنگ 'خلیجی جنگ کی طرح' بلاشبہ اسلام اور مغرب کے درمیان اسی تہذیبی جنگ کی ابتدائی جھڑپ ہے 'جس کی خبر مغربی دانش ور اور سیاست دان کچھ عرصے سے بڑے زور شور سے دے رہے ہیں۔ لیکن یہ جنگ جس عیاری و مکاری اور بربریت و درندگی کے ساتھ لڑی جارہی ہے 'اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ "مہذب" مغرب کو اپنے تئیں اسلام کے خلاف یہ جنگ لڑنے میں تہذیب اور انسانیت کی کسی ادنیٰ سی قدر کو بھی پامال کرنے میں ذرہ برابر تامل نہ ہو گا۔ بوسنیا کو مذبح خانہ بنانے کا کام --- انسانوں کا 'ان کی عصمتوں کا 'ان کی املاک کا 'ان کے تہذیبی ورثے کا مذبح خانہ۔ بے شک سرب انجام دے رہے ہیں 'لیکن مغربی طاقتیں 'خصوصاً برطانیہ 'فرانس اور امریکہ 'اس جرم میں ان کی برابر کی شریک ہیں۔ جس بے شرمی سے یہ سربوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں 'ان کے جرائم میں ان کی اعانت کر رہے ہیں 'ان پر پردہ ڈال رہے ہیں 'بوسنیا کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ذبح کر رہے ہیں 'اس کے حصے بخرے کر کے اس کا نام و نشان مٹانے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں 'وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ مغربی طاقتیں ساتھ نہ دیتیں 'تو سربیا ہرگز یہ سب کچھ نہ کر سکتا۔

سربوں کی درندگی اور مغرب کی طرف سے ان کی پشت پناہی دیکھ کر مغرب کے اہل ضمیر بھی چیخ اٹھے ہیں: پیرس کے پروفیسر بروکنر (Bruckner) کہتے ہیں: یہ قانون کی پسپائی ہے۔ نازی ازم کی شکست کے ۴۶ سال بعد ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ یورپ تہذیب 'امن اور سلامتی کا گہوارہ نہیں ' یہاں بربریت کا راج ممکن ہے۔ ہم جن یورپین اقدار پر یقین کے دعوے دار تھے 'وہ ایک سراب ثابت ہوئی ہیں۔ اگر یورپ کی زمین پر بربریت ممکن ہے 'تو ہماری پوری تہذیب ہی مشتبہ ہے"۔

(مجلہ Praxis' آکسفورڈ' ج ۱۲' ص ۲۲۹) اسی مجلّے کے اداریہ نگار لکھتے ہیں: "کہا جاتا ہے کہ 'سرائیوو میں یورپ مر رہا ہے'۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ مر رہا ہے وہ یورپ سے کہیں زیادہ قیمتی ہے: انسان کا یہ حق کہ اس کے کچھ حقوق ہیں"۔ (ایضاً ص ۲۲۰-۲۲۱)

ڈیوڈ (Rielf) بوسنیا کا مذبح خانہ اور مغرب کی ناکامی (Slaughterhouse Bosnia and the Failure of West) میں مرثیہ خواں ہے: "گذشتہ ڈھائی سالوں میں بوسنیا میں بے شمار خواب موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں: یہ خواب کہ عالمی ضمیر نام کی کوئی چیز پائی جاتی ہے! یہ خواب کہ یورپ ایک تہذیب یافتہ علاقہ ہے! یہ خواب کہ انصاف کمزور کا حق اسی طرح ہے جس طرح طاقت ور کا! یہ خواب کہ سچائی کا علم ہمیں بدی سے نجات دینے کے لیے کافی ہے! کامل شکست! انتہائی شرم ناک!" (ص ۲۲۵)

لف شلز (Lif Schultz) اور ربیعہ علی 'بوسنیا کیوں؟ 'Why Bosnia' میں لکھتے ہیں: بوسنیا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ طاقت ور ریاستوں کے اقدامات میں اخلاقی اور انسانی اصولوں کے نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اس کے باوجود وہ زور شور سے دنیا کو ان اعلیٰ اخلاقی اقدار کے درس پر درس دیتے رہتے ہیں جن پر' ان کے سوا' ساری دنیا کو کاربند رہنا چاہیے۔ نیورمبرگ کے اصول' بنیادی حقوق کے چارٹر' جینیوا کنونشن' ہیلسنکی اعلامیہ یہ سب ان کے نئے "عقائد اور شریعت" ہیں' [اپنے مخالفین کو قابو میں رکھنے کے ہتھیار] لیکن وہ ان کو اپنے معاملات خراب کرنے کی اجازت کبھی نہیں دیتے"۔ (ص xii)

تین سال سے زائد ہو گئے ہیں' اپریل ۱۹۹۲ سے سربوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کو' صرف مسلمانوں کو' بد ترین وحشیانہ کارروائیوں کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ ڈھائی لاکھ سے زیادہ مسلمان ذبح کیے جا چکے ہیں' ہزاروں کو پکڑ کے اور باندھ کر گولی ماری گئی ہے' ۵۰ ہزار سے زائد عورتوں کی عصمت دری کی جا چکی ہے' ہزاروں بچوں کو دیوار پر مار کر اور ٹینکوں کے آگے ڈال کر قیمہ قیمہ کیا گیا ہے' لاشوں کا مثلہ کیا گیا ہے' ناک کان کاٹ کے اور آنکھیں نکال کے ہار بنائے گئے ہیں' کھوپڑیاں پھاڑ کر مغز نکالا گیا ہے' ۲۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان بے گھر کیے جا چکے ہیں' ان کی بستیاں ملبہ بنا دی گئی ہیں (ایک وقت تھا کہ ۲۰ گاؤں روزانہ کے حساب سے)' ہزاروں مسجدیں' تین بڑی بڑی لائبریریاں' صدیوں پرانے مخطوطات' سیکڑوں مدرسے' فن تعمیر کے خوب صورت نمونے' مکانات' پل' پورے کے پورے شہر (مثلاً فوچا' موستر' پرانا سرائیوو) تباہ و برباد کر کے' جلا کے مٹا دیے گئے ہیں۔ مغربی ممالک اور اقوام متحدہ بڑی دلچسپی اور خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھتے رہے ہیں۔

تازہ ترین کھیل سرے برے نیکا (Srebrenica) اور زیپا (Zepa) میں جولائی میں کھیلا گیا۔ یہ کھیل مغربی طاقتوں کے عزائم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ دونوں' ان ۶ شہروں میں سے تھے جنھیں اقوام متحدہ اور مغربی طاقتوں نے مسلمان شہریوں کے لیے "محفوظ پناہ گاہ" (safe havens) قرار دیا تھا' جہاں وہ سربوں کی غارت گری سے مامون ہوں گے۔ ان کی حفاظت کے لیے اقوام متحدہ کے فوجی دستے موجود تھے۔ تمام بین الاقوامی ضمانتوں اور حفاظتوں کے باوجود' سربوں نے اقوام متحدہ کے فوجیوں کو الٹی میٹم دیا' جو راستے سے نہ ہٹے' اور وہ چند ہی تھے' انھیں یرغمال بنالیا' اور سرے برے نیکا پر قبضہ کر لیا۔ چند دن میں ۴۲ ہزار مسلمانوں کا صفایا ہو گیا۔

کیمروں کے سامنے 'فاتح کمانڈر جنرل ملاڈچ نے اقوام متحدہ کے ڈچ کمانڈر کے ساتھ جام فتح نوش کیا' مسلمانوں کی پیٹھیں تھپکیں' ان میں چاکلیٹ تقسیم کیے' انھیں امن و امان کا یقین دلایا۔ کیمروں کے ہٹتے ہی خونیں کھیل شروع ہو گیا۔ بوڑھوں اور بچوں کو دوسری محفوظ پناہ گاہ' تزلا (Tuzla) روانہ کر دیا' جوان عورتوں کو عصمت دری کے لیے چن لیا' نوجوان لڑکوں سمیت جو بھی لڑنے کے قابل تھے انھیں الگ کر کے گولیوں سے بھون دیا۔ اس کے بعد زیپا کی باری تھی وہ بھی اسی انداز میں فتح کر لیا گیا۔ پھر بیہاچ کا نمبر تھا' کہ کروشیا نے سربوں پر حملہ کر دیا۔

مغربی طاقتوں کا ردعمل کیا تھا؟ امریکہ نے سرے برے نیکا کے نزدیک تازہ تازہ اجتماعی قبروں کی ہوائی تصویریں اقوام متحدہ میں پیش کر دیں' تو برطانیہ اور فرانس نے سخت ناک بھوں چڑھائی۔ اس سے پہلے 'لندن میں ایک روزہ کانفرنس ہوئی' تو اعلان کیا گیا کہ اب اگر گورازدے (Gorazde) پر سربوں نے حملہ کیا تو سخت کارروائی کی جائے گی' یہ گویا لائسنس تھا کہ باقی محفوظ علاقے تم فتح کر سکتے ہو۔ گورازدے بھی۔ کیونکہ کانفرنس کے صدر' برطانوی وزیر خارجہ نے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی: "ہم جنگ ہرگز نہیں کریں گے"۔ ساتھ ہی اصل عزائم بھی زبان سے ٹپک پڑے: "ٹھیک ہے' اب بوسنیا کے لیے ہماری تازہ ترین پیش کش موجود ہے: سرے برے نیکا' زیپا اور گورازدے سے بالکل دست بردار ہو جاؤ' اور اس کے بدلے --"

"یہ" محفوظ پناہ گاہیں وجود میں کیسے آئیں؟ یہ بھی ایک شرمناک داستان ہے۔

ستمبر ۱۹۹۱ میں' جب سربوں نے پہلے سلووینیا اور پھر کروشیا پر حملہ کیا' تو برطانیہ اور فرانس کی خواہش پر' اور سربوں کی درخواست پر' سیکورٹی کونسل نے سارے یوگوسلاویہ کو اسلحے کی فراہمی پر پابندی عائد کر دی۔ یہ پابندی آج تک برقرار ہے۔ یہ پابندی سراسر سربوں کے مفاد میں ہے' اور

سراسر بوسنیا کے خلاف ۔ بوسنیا نے اپنی آزادی کے لیے حرف بحرف امریکہ اور یورپ کی ہدایات پر عمل کیا ۔ وہ 'سلووینیا اور کروشیا کی طرح' یوگوسلاویہ سے علیحدہ نہ ہوا تھا ۔ اس نے یورپ کی ہدایات کے مطابق ریفرنڈم بھی کرایا تھا ۔ سربوں نے اس کی سرحدوں کو عبور کر کے جارحیت کی تھی ۔ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت اپنے دفاع کا حق رکھتا تھا' اور دفاع کے لیے اسلحے کے حصول کا بھی ۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ نے بوسنیا کی سرحدوں کو تسلیم کرنے کے باوجود' اس پر اپنے دفاع کے لیے اسلحہ حاصل کرنے پر پابندی برقرار رکھی' اور اس کے اٹھانے کی شدت سے مخالفت کی' اگرچہ انھوں نے اس کے دفاع کا انتظام بھی نہ کیا ۔

لندن کی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز کے مطابق' بوسنیا میں سرب فوج کی طاقت کو' جسے یوگوسلاویہ فوج سے سارے ہتھیار مل گئے تھے' بوسنیا کی فوج کے مقابلے میں دس گنا برتری حاصل تھی ۔ بوسنیا کے پاس مشکل سے ۲ ہزار ۵ سو فوج تھی ۔ ستمبر ۹۲ میں اس کے پاس ۲ ٹینک' اور ۲ مسلح گاڑیاں تھیں' جب کہ سرب فوج کے پاس ۳ سو ٹینک' ۲ سو گاڑیاں' ۸ سو توپیں اور ۴۰ ہوائی جہاز تھے ۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۲ کو جنرل اسمبلی کو اس شرمناک تضاد کا احساس ہوا کہ ایک 'رکن ریاست کو چارٹر کی شق ۵۱ کے تحت اپنے دفاع کے لیے اسلحہ حاصل کرنے کا اختیار بھی نہیں ۔ چنانچہ اس نے بھاری اکثریت سے "بوسنیا پر سے پابندی اٹھانے کی قرارداد پاس کی' اور سیکورٹی کونسل سے کہا کہ وہ اپنا فیصلہ منسوخ کر کے بوسنیا کی سالمیت کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کرے" ۔ لیکن سیکورٹی کونسل نے اس کو بالکل نظرانداز کر دیا' اور اسلحہ دینے کے بجائے ۶ "محفوظ مقامات" قائم کر دیے ۔ اس کے بعد اسلحہ پر پابندی ختم کرنے کی تمام کوششیں اور اپیلیں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں' یہاں تک کہ امریکن کانگریس کی قرارداد کو بھی صدر کلنٹن نے ویٹو کر دیا' حالانکہ وہ اپنے انتخاب کے وقت بوسنیا میں فوجی مداخلت کی حمایت کر رہے تھے ۔

سربرے برے نیکا پر سرب قبضے کے بعد ایک چشم دید گواہ نے دیکھا کہ ۵ سو مسلمان نوجوانوں سے پہاڑوں میں گھٹنوں کے بل مارچ کرائی جا رہی ہے' اور ان کے ہاتھ پیچھے گردنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں ۔ پھر ان سب کو گولی مار دی گئی ۔ امریکہ' برطانیہ' فرانس اور یورپ نے بالکل یہی عمل پورے بوسنیا کے ساتھ کیا ۔ پہلے اس کے ہاتھ پیچھے گردن کے ساتھ باندھے' پھر اسے اپنے دفاع کے لیے ہتھیاروں سے محروم کیا' پھر اسے دشمن کے آگے گھٹنوں کے بل رینگنے پر مجبور کیا' پھر دشمن کو شہ دی اور اس کی پشت پناہی کی کہ وہ اس کا ایک ایک عضو کاٹے اور اس کے سارے جسم کو چھلنی کر

دے۔

مغربی طاقتوں کی دلیل ہمیشہ ایک رہی: اسلحے کی فراہمی سے خون ریزی اور بڑھ جائے گی۔ لیکن اس سے زیادہ اور کیا خون ریزی ہوتی جتنی ہو چکی ہے۔ بوسنیا تو اتنا سخت جان ثابت ہوا کہ صرف ۲ ہزار ۵ سو فوج اور ۲ ٹینکوں سے شروع کر کے وہ ۳ سال تک اپنا دفاع کرتا رہا ہے' اور کسی طرح اسے مٹایا نہیں جا سکا ہے۔ اگر اس کے پاس اسلحہ بھی ہوتا تو کیا صرف اسلحے کی موجودگی سرب جارحیت کو روکنے کے لیے کافی نہ ہوتی؟

کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک نے اپنی داخلی سیاست کے دباؤ کی وجہ سے ایک طویل جنگ میں الجھنے سے بچنے کی خاطر' بوسنیا میں تیل' اسرائیل اور اس طرح کے دوسرے مفادات نہ ہونے کی بنا پر' اپنا خون بہانے سے اجتناب کی خاطر' بوسنیا کی سالمیت کے تحفظ کے لیے فوجی مداخلت نہیں کی' نہ اقوام متحدہ اور نیٹو (Nato) کو سربوں کے خلاف ہتھیار استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس اخلاقی بزدلی اور منافقت کا کوئی جواز تو ممکن نہیں' پھر بھی یہ قابل فہم ہے۔ لیکن خود بوسنیا کے لوگوں کو بوسنیا کے دفاع سے روکنے کا کیا جواز ہے' یہ کس طرح قابل فہم ہے؟ سوال تو پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغرب واقعی بوسنیا کے مسلمانوں کی خوں ریزی روکنا چاہتا تھا' کیا اسے واقعی بوسنیا کی سالمیت کی حفاظت مطلوب تھی؟ ہمیں یقین ہے کہ نہیں۔ بوسنیا میں جو کچھ ہوا' مغرب کے عزائم اور منصوبوں کے عین مطابق ہوا۔ برطانوی وزیر دفاع نے کہا کہ اسلحے پر بندش کا خاتمہ تو بدترین حل ہے۔ پوچھا گیا کہ کیوں؟ جواب میں دل کا راز زبان پر آ ہی گیا: "پھر کنٹرول ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا" (دی نیشن' ۲۴ مارچ' ۹۳)۔ گویا پھر بوسنیا میں ہم وہ کچھ نہیں کر پائیں گے جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔

مغربی طاقتوں کے لیے مشکل یہ ہو گئی کہ ان اندازوں کے برخلاف' سرب نااہل نکلے' بوسنیا سخت جان ثابت ہوا' اس کو جلد ختم کرنا ممکن نہ ہوا' وہ جان کنی کے عالم سے بار بار واپس لوٹ آیا۔ نتیجتاً 'انھیں' ساری بے شرمی کے باوجود اپنے "مہذب" اور "انسانی حقوق" کے علم بردار ہونے کی لاج رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ مسلسل کرنا پڑ رہا ہے۔ یہی ان پر سخت گراں ہے۔ سرائیوو کے اردگرد سربوں کے بھاری ہتھیاروں کے خلاف نیٹو کی تازہ ترین بم باری بھی اسی قبیل کا اقدام ہے۔ اب بوسنیا بظاہر ختم ہو چکا ہے' یہ اشک شوئی ہے۔

اسلحے کی فراہمی کے معاملے ہی میں نہیں' ہر معاملے میں مغربی ممالک کھلم کھلا سربیا کی حمایت اور بوسنیا کی مخالفت میں سرگرم رہے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس بات کے لیے تیار معلوم ہوتے ہیں کہ

مسلمانوں کو ریڈ انڈینوں کی طرح کوئی "ریزرویشن" یا افریقہ کے کالوں کی طرح کوئی "لیسوتھو" (Lesotho) مل جائے، اور وہ اس پر قانع ہو جائیں۔

دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ گھڑتے رہے ہیں، اور اسے زور و شور سے پھیلاتے رہے ہیں۔ عملاً ان کا منصوبہ یہ رہا ہے کہ سربوں کی درندگی کی طرف سے چشم پوشی کی جائے اور اس پر پردہ ڈالا جائے، ظالم اور مظلوم کو برابر ثابت کیا جائے، بوسنیا کو مجبور کیا جائے کہ سربیا کی "نسلی صفائی" اور فتوحات کے نتائج تسلیم کر لے، نسلی بنیادوں پر تقسیم پر راضی ہو جائے، ورنہ مکمل خاتمے کا انجام بھگتنے کے لیے تیار رہے۔ انھی اہداف کے حصول کے لیے، وہ سربوں سے بڑھ کر سربوں کے مفاد میں جھوٹا پروپیگنڈا کرتے رہے ہیں۔

سربوں کی نسلی صفائی، بے تحاشا قتل اور عصمت دری، ان کے کیمپ اور ان میں ہڈی کے ڈھانچے پہلی دفعہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے اگست ۹۲ میں ٹی وی اسکرین پر آئے۔ کیا میونخ سے ایک گھنٹے اور پیرس سے دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہونے والی ان بہیمانہ کارروائیوں سے امریکہ، برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک کی انٹیلی جنس کے ذرائع بے خبر ہو سکتے تھے؟ ہرگز بھی نہیں۔ لیکن یہ سب ممالک جان بوجھ کر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ جب دنیا میں شور مچا تو امریکی وزیر خارجہ، بیکر (Baker) نے اسے محض "یورپ کے قلب میں ایک سنگین انسانی مسئلہ" قرار دیتے ہوئے صرف امدادی کوششوں پر زور دیا، ان مظالم کو روکنے کے لیے کسی مدد یا کارروائی پر نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "جب تک سارے ذرائع آزما نہ لیے جائیں، قوت استعمال نہ ہوگی"۔ صدر بش نے ان مظالم کو "انتقام در انتقام" اور "صدیوں پرانی دشمنیوں کا ایک الجھا ہوا نتیجہ" قرار دیا، لیکن انھوں نے نہ یہ کہا کہ مظالم ختم کیے جائیں، نہ یہ کہ کیمپ بند کیے جائیں، بلکہ صرف "کیمپوں تک ریڈ کراس کی رسائی" کی درخواست کی۔ اقوام متحدہ کے انسانی امداد کے ادارے کے سربراہ نے کہا: "ہاں، کچھ ناخوشگوار حالات ضرور پائے جاتے ہیں"۔

مظلوم مسلمانوں کو ظالم سربوں کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لیے بڑے بڑے لوگوں کو عار نہیں۔ برطانوی کمانڈر جنرل روز (Rose) نے 'بی بی سی کے پینوراما پروگرام میں گورازدے کے چند جلے ہوئے مکانوں کو دکھاتے ہوئے کہا: "یہاں سے مسلمانوں نے ۱۲ ہزار ۵ سو سربوں کا نسلی صفایا کیا"۔ خود اقوام متحدہ کے سارے ریکارڈ میں ایسے کسی واقعہ کا ذکر نہیں۔ لیکن ۱۹۹۱ کی مردم شماری کے ریکارڈ دیکھنے سے پتا چلا کہ پورے گورازدے ضلع میں ۱۰ ہزار سرب تھے، شہر میں مشکل سے ۵ ہزار ہوں گے، پھر جنرل روز جیسے ذمہ دار نے یہ من گھڑت جھوٹ کیسے بول دیا؟ لیکن ایک جنرل کا بیان، بی بی سی کی

آواز' یہ "کلام مقدس" ہر ایک نے دہرایا۔ ایک سینیر امریکن ڈپلومیٹ کو برطانوی وزارت خارجہ میں بریفنگ دی گئی' تو اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا: "اتنی زبردست بریفنگ کا ایک ہی ہدف تھا: زیادہ سے زیادہ الزام مسلمانوں پر رکھا جائے"۔

ایک ٹیکنیک یہ بھی خوب استعمال کی گئی کہ جو مظالم سرب کر رہے ہیں ان کو بھی مسلمانوں کے سر ڈال دیا جائے۔ جب اقوام متحدہ کے فرانسیسی دستے کی حفاظت میں سفر کرنے والے 'بوسنیا کے نائب وزیر اعظم حاکیہ تو انیلیک کو سربوں نے گولی مار دی' تو تحقیقاتی رپورٹ میں اس کا الزام بھی مسلمانوں پر رکھا گیا کہ انھوں نے "تشویش کا ماحول پیدا کر دیا تھا"۔ سرائیوو میں سربوں نے ۱۹۹۲ میں' ایک بم روٹی خریدنے والوں پر' اور ۱۹۹۴ میں ایک بم بازار میں پھینکا۔ کسی شہادت کے بغیر کہ ان واقعات میں حکومت بوسنیا کا ہاتھ تھا' اقوام متحدہ کے پہلے کمانڈر 'کینیڈا کے جنرل میکنزی نے کھلم کھلا اسی پر الزام لگا دیا۔

اور بھی بے شمار جھوٹ تھے جو بڑے شد و مد سے پھیلائے گئے۔ ایک یہ کہ بلقان میں تو خون ریزی ہوتی ہی رہتی ہے۔ حالانکہ یورپ میں جتنی خون ریزی برطانیہ' فرانس اور جرمنی کے مابین ہوئی ہے اس کی مثال تو پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ پہلی جنگ عظیم میں ۸۴ لاکھ لوگ 'ہلاک' اور ۲ کروڑ زخمی و معذور ہوئے' دوسری جنگ عظیم میں ۶ کروڑ کے قریب ہلاک ہوئے۔

ایک یہ کہ وہاں تو "پرانی نسلی عداوتیں ہیں" جو بار بار بھڑکتی رہتی ہیں۔ حالانکہ بوسنیا میں تینوں گروہ صدیوں سے صلح و آشتی سے رہتے چلے آئے تھے' اپنی رواداری اور متنوع معاشرے کے لحاظ سے یہ یورپ کی جنم میں ایک 'منفرد جنت' اور اس کے 'ماتھے کا جھومر' تھا۔ پھر وہاں 'مسلمان' سرب اور کرواٹ کی نسلوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق بھی نہیں۔

ایک یہ کہ بوسنیا نام کا نہ کبھی کوئی ملک رہا ہے' نہ قوم۔ اس کو آزاد بننے کا شوق کیوں چرایا' اسے یہ حق کیسے مل سکتا ہے؟ نیویارک ٹائمز کے سابق ایڈیٹر روزینتھال نے لکھا: "مسلمان لیڈروں نے ایک ایسے بوسنیا کی آزادی کا اعلان کیا ہے جس کا بحیثیت قوم کبھی وجود نہیں رہا' جہاں مسلمان کبھی اکثریت میں نہیں رہے' جہاں کوئی بوسنین نہیں بستے" (۱۶ اپریل ۹۳)۔

برطانیہ کے ٹوری مورخ' نوئل میلکم (Malcolm) نے اپنی خوبصورت اور محققانہ کتاب 'Bosnia: A Short History' میں مغربی حکومتوں کے اس سارے کذب و افترا کا پردہ مکمل طور پر اور موثر انداز میں بالکل چاک کر دیا ہے۔

مغربی طاقتیں بوسنیا کے خلاف سربیا کی ننگی اور وحشیانہ جارحیت 'نسلی صفائی' قتل عام 'عصمت دری'

اور ۶۰ فی صدی بوسنیا پر سرویا کے قبضے کو محض ایک ''خانہ جنگی'' قرار دینے پر تلی ہوئی ہیں۔اس کا مقصد ظالم و مظلوم کو مساوی رکھنے 'اور جارحیت کے پھل کو مستقل جواز دینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تمام مغربی طاقتوں کی ''صلح جوئی'' کی ساری کوششوں کا ہدف یہ اور صرف یہی رہا ہے: ''بوسنیا کو سربوں اور کروایئوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے 'مسلمان' چند علاقوں میں محفوظ کر دیے جائیں''۔کیرنگٹن (Carrington) ' وانس (Vance) 'اوون (Owen) سب کے فارمولوں کی غرض و غایت یہی رہی ہے۔

اپریل ۱۹۹۳میں امریکی وزیر خارجہ 'وارن کرسٹوفر نے بوسنیا کے صدر کے نام ایک خط لکھا جس میں ان پر زور دیا کہ وہ بوسنیا کی وہی تقسیم قبول کر لیں جس پر سرویا کے صدر مالوشیوچ اور کروشیا کے صدر ٹجمین اتفاق کر چکے تھے 'اور جس پر صلح کے مشن پر مامور برطانیہ کے ڈاکٹر اوون اور ناروے کے سٹولٹن برگ مہر تصدیق ثبت کر چکے تھے۔اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے چند باضمیر افسران نے اس موقف کے خلاف شدید احتجاج کیا' ۴ افراد نے استعفے بھی دیے 'لیکن ۱۹ اگست کو یہ خط چلا گیا۔اپریل ۱۹۹۳میں صدر کلنٹن نے نسلی صفائی اور تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی کہ یہ غیرانسانی ہے 'یہ غلط ہے 'ہمیں اس کے خلاف کھڑا ہونا چاہیے۔لیکن جب ستمبر میں عزت بیگ ان سے ملے 'ان کا پیغام بھی یہی تھا: مان لو۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ تینوں بڑوں کے جو وزرا اور افسران اس مسئلے پر لگے ہوئے تھے 'ان سب کے سرویا کے لیڈروں سے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔بوسنیا کے بحران کے وقت ایگل برجر (Eagle Burger) بش انتظامیہ میں ڈپٹی سیکرٹری آف اسٹیٹ تھے۔وہ ۷۰ کی دہائی کے اواخر میں بلغراد میں امریکی سفیر تھے 'اور مالوشیوچ کے گہرے دوست۔ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ہنری کسنجر ایسوسی ایٹس میں شامل ہو گئے اور اس کے صدر بھی بن گئے۔اس فرم کو سرویا کے بڑے بڑے کام ملا کرتے تھے۔وہ یوگو امریکہ (Yogo America) کے ڈائرکٹر بھی تھے جو سرویا کے کار ساز کارخانے کی امریکن شاخ تھی۔نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر' سکوکرافٹ (Scowcraft) تھے۔یہ بھی ۱۹۶۰میں بلغراد میں امریکہ کے ہوائی اتاشی تھے 'اور سرویا کے لیڈروں کے گہرے دوست۔بوسنیا پر سرویا کے حملے کے بعد وزیراعظم جان میجر نے لندن میں کانفرنس بلائی تاکہ ایک ایسی ''پالیسی'' کو عملی جامہ پہنایا جائے 'جس کا نہ اعلان ہوا تھا نہ اس پر کوئی مباحثہ۔اس کانفرنس میں ایگل برجر نے کلیدی خطاب کیا۔وہ پورے وقت تاریخ میں سربوں کے بے پناہ مصائب کا رونا روتے رہے 'و''کشمکش'' کو ''قدیم'' اور ''الجھا ہوا'' قرار دیا 'مگر بوسنیا کا ذکر تک نہ کیا 'نہ اس کے بقا کی امید کا اظہار کیا۔یہ نفاست سے اس بات کا اعلان تھا کہ مغربی

طاقتیں بوسنیا کے خاتمے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔

مغربی حکمرانوں کی جانب سے بوسنیا میں اتنی شرمناک اور اتنی منظم مسلم دشمنی کے کردار کی تہہ میں اصل سبب کیا ہے؟ وہ خود تو کھل کر کہتے نہیں --- کہ کہیں ان کے دعویٰ تہذیب پر داغ نہ لگ جائے --- لیکن یہ راز 'کوئی راز نہیں رہا ہے۔ بلاشبہ سربوں کا استدلال اور موقف ہی ان کے دل کی بھی آواز ہے۔

بوسنیا کے سرب لیڈر کراوزچ (Karadzic) ایک انٹرویو میں کہتے ہیں: "ہمارا جنگی مقصد یورپ کو بوسنیا میں ایک مسلمان ریاست کے خطرے سے بچانا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھی مسلم ریاست یورپ میں مسلم دہشت گردی کا مرکز بنے گی" (نیویارک ٹائمز ' ۱۸ جولائی ۹۳)۔ چنانچہ سرب بالعموم یہ سمجھتے ہیں 'اور برملا کہتے ہیں: ہم اسلام 'مسلمان اور ترک کے خلاف یورپ کی جنگ لڑ رہے ہیں 'ہم عیسائیت کی جنگ لڑ رہے ہیں 'ہم آخری صلیبی جنگ لڑ رہے ہیں۔ بوسنیا میں مسلم ریاست قائم ہو گئی تو انتہا پسند ' دہشت گرد 'بنیاد پرست "مجاہدین" سارے یورپ پر چھا جائیں گے۔ فوچا کی ایک سرب عورت نے دانتو کے نامہ نگار سے کہا: "وہ رہا میدان 'یہاں سے جہاد شروع ہوتا تھا 'فوچا ایک اور مکہ بنتا' ان سربوں کی فہرستیں بن گئی تھیں جنھیں موت کے گھاٹ اتارا جاتا' ان میں دو میرے بیٹے بھی تھے جنھیں سور کی طرح مارا جاتا' اور میری عصمت دری کی جاتی !" (میلکم ' بوسنیا ، ایک مختصر تاریخ 'ص ۲۴۷)

فرانسیسی حکومت میں بھی اس کی صدائے بازگشت سنی جاسکتی تھی: نیویارکر کے جان نیو ہاؤس سے ایک اعلیٰ سفارت کار نے کہا: "ہم نہ صرف جنگ کو پھیلنے سے 'بلکہ یورپ میں ایک مسلمان ریاست کے قیام کو بھی روکنا چاہتے ہیں 'جو جلد ایک خوش حال 'جنگ جو' اور ہر جگہ لڑائی جھگڑے کا مرکز بن جائے گی۔ [اس لیے بوسنیا کا نام و نشان مٹنا چاہیے 'اس طرح کہ مستقبل میں ایسے کسی خطرے کا اندیشہ بھی باقی نہ رہے]۔ ہم مسلمانوں کو 'فلسطینیوں کی طرح 'یورپ میں تتربتر بھی نہیں ہونے دینا چاہتے [کہیں وہ ایک خطرہ نہ بن جائیں 'اس لیے مسلمانوں کی نسل کو بھی ختم کرنا ضروری ہے"]۔ "تم سوچ نہیں سکتے ہمارے مفادات سرب مفادات سے کتنے قریب ہیں۔ ہمیں سربوں کے بارے میں پریشانی نہیں 'مسلمانوں کے بارے میں ہے"۔ یہی بات جون ۱۹۹۳ میں 'روس کے صدر یلسن کے مشیر برائے امور بلقان ' ولادیمیر فاکوف (Volkov) نے ییل (Yale) یونی ورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہی: سربوں کی چند "کارروائیاں" قابل افسوس ضرور ہیں 'لیکن دراصل تو دنیا کو اور یورپ

کو --- دھوکہ باز ' ناقابل اعتماد اور دوغلے مسلمانوں پر نگاہ رکھنا چاہیے - بوسنیا ' یورپ میں ترک اور البانیوی امپیریلزم کے لیے ایک پل ثابت ہو گا" -

کہاں ننھا بوسنیا جس کے ۷۰ فی صد علاقے پر سرب قبضہ کر چکے ہیں ' جس کو سربیا کے مالوشیوچ اور کروشیا کے ٹج مین ' شدید دشمنی کے باوجود ' باہم تقسیم کر کے ہڑپ کر جانے کا معاہدہ کر چکے ہیں ' جس کو ختم کرنے پر ساری مغربی طاقتیں تلی ہوئی ہیں ' اور کہاں یورپ میں ترک امپیریلزم کا امکان! لیکن ماضی اور مستقبل کی یہ تعبیر مغرب کے دماغ پر اس طرح نقش ہے کہ ۱۴سو سال گزر جانے کے باوجود یہ نقش مدھم نہیں پڑا ہے -

افسوس اور تعجب ہے تو اس بات پر کہ بوسنیا کے مسلمان لیڈروں نے ' سلووینیا اور کروشیا کی طرح ' اپنی آزادی کا اعلان کرنے سے پہلے ' اپنے دفاع کی کوئی بھی تیاری نہیں کی "ولڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں" کا مصداق بن گئے - انھوں نے اپنی حفاظت اور بقا کے لیے مغرب ' امریکہ ' یورپ ' اقوام متحدہ ' عالمی ضمیر ' یورپ کی تہذیبی اقدار اور انسانیت پر "توکل" کیا ' جو سب کے سب تار عنکبوت ثابت ہوئے - وہ یہ بھی یاد نہ رکھ سکے کہ مغرب نے آج تک کوئی جنگ کسی مظلوم کی امداد یا کسی اخلاقی اصول کی خاطر نہیں لڑی ہے - دوسری جنگ عظیم نہ پولینڈ کے غم میں تھی ' نہ یہودیوں کو بچانے کے لیے ' نہ جمہوریت اور آزادی کی خاطر - مکھی مکڑی کے جال میں پھنس گئی اور اب مادی اندازوں کے مطابق اس کا زندہ بچ نکلنا ممکن نہیں - لیکن اللہ کی تدبیر کے آگے کس کی تدبیر ٹھہر سکتی ہے ' وہ اس جالے کو توڑ سکتا ہے ' اسی جالے کو نجات کا ذریعہ بنا سکتا ہے - وما ذالک علی اللہ بعزیز -

مغرب نے جو مسلم کشی کی روش اختیار کی اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں - آج کے حکمراں ' کل کی "تہذیب" کے وارث ہیں - اس "تہذیب" کے پور پور سے خون آشامی ٹپکتی ہے ' اس نے اپنے مفادات کے لیے آبادیوں کی آبادیوں کو نیست و نابود کر دیا ' اور ضمیر میں ادنیٰ سی بھی خلش محسوس نہ کی: یہ یورپین تھے جنھوں نے "نسلی صفائی" کی خاطر ۶۰ لاکھ یہودیوں کو مٹایا ' یہ انھی یورپین یہودیوں کے وارث تھے جنھوں نے ۶۰ لاکھ سے بھی زائد فلسطینیوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا ' ان کا خون بہایا ' انھیں گھر بدر کر کے تتر بتر کر دیا اور ان کے سارے حقوق غصب کر لیے ' یہ یورپین "مہاجر" تھے جنھوں نے امریکہ میں ریڈ انڈینوں کا نسلی استیصال کیا ' ان کے اموال و املاک کو چھین لیا ' اور ان کو "محفوظ علاقوں" میں دھکیل کر بند کر دیا ' انھوں نے ہی لاکھوں کالوں کو افریقہ سے پکڑ کے غلام بھی بنایا اور زندہ بھی جلایا ' انھی کے اسلاف نے لاکھوں افراد کو زندہ جلا کر اپنے فرقہ وارانہ اختلافات کی بھینٹ چڑھایا - ان کے اولین اسلاف رومن حکمران تھے: انھوں نے کارتھیج فتح کیا (۱۴۶ ق م) تو ۶ دن

تک قتل عام ہوتا رہا اور پورے شہر کو خاکستر کر دیا' بیت المقدس فتح کیا (۶۴ ب م) تو ۱۰ لاکھ سے زائد یہودی تہہ تیغ کر دیے' اور ایچ جی ویلز کے مطابق "وہ اپنے دشمنوں کے بارے میں اتنے بے محابا اور جوش و خروش سے جھوٹ بولتے تھے کہ آج کا پروپیگنڈسٹ بھی شرما جائے..... جب وہ کسی قوم کے خلاف الزامات عائد کرتے تو یہ ان کے قتل عام کا پیش خیمہ ہوتا" (آج بوسنیا میں بالکل یہی کہانی دہرائی جا رہی ہے)۔

ہم گڑے مردے اکھاڑ کر نفرت کا الاؤ نہیں سلگانا چاہتے' جس میں کل کے گناہوں کے لیے آج کے بے گناہ بھسم ہو جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان امن و آشتی اور محبت عام ہو' ہم چاہتے ہیں سارے انسان ایک خدا کے بندے بن کر اس کا خاندان بن کر ساتھ رہیں۔ ہم مغرب کو یہی پیغام دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ محاذ آرائی کے بجائے خوش گوار تعلقات کے خواہاں ہیں۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو بوسنیا کے مسلمانوں کی طرح حقائق سے آنکھیں بند نہیں کرنا چاہییں' انھیں تلخ تہذیبی حقائق سے واقف ہونا چاہیے' اگر وہ تاریخ سے ناواقف ہیں تو انھیں کم سے کم آج کے بوسنیا سے ضرور سبق سیکھنا چاہیے' انھیں انسانیت کے نام پر مغرب کے اہل ضمیر کے ساتھ یک جہتی ضرور استوار کرنا چاہیے لیکن مغرب کے معبودان باطل سے جھوٹی امیدیں نہیں رکھنا چاہییں' انھیں "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" (حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۳۴) اور "وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" کے ساتھ ساتھ "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" اور "حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ" (الانفال ۸: ۶۱' ۶۰' ۶۵) کی ہدایت پر بھی کان دھرنا چاہییں ورنہ وہ بوسنیا کے مسلمانوں کی طرح نہتے کر کے' ہاتھ پیچھے باندھ کر' مارے جائیں گے' اور ان کا پورا جسد بھی چھلنی اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے گا۔

اپنا نمونہ پیش کیجیے

اپنی اولاد کی
اپنے زیرِ نگیں افراد کی' اپنی رعیت کی'
اصلاح مطلوب ہے۔۔۔ تو
اپنی اصلاح کیجیے

✿ ○ ✿

اصلاح کا موثر ترین ذریعہ
وعظ و نصیحت نہیں'
اپنا نمونہ پیش کرنا ہے۔
آپ روزانہ تلاوت قرآن نہ کریں' وہ کریں
آپ نماز باجماعت ادا نہ کریں' وہ کریں
آپ خدا اور آخرت کا خوف نہ کریں' وہ کریں
۔۔۔ یہ توقع مت رکھیے
اور ہاں۔۔۔
یہ ان کے ساتھ بد ترین بد خواہی ہے۔
آپ خود اچھے بنیں' وہ ضرور اچھے بنیں گے۔
وہ تو آپ کا آئینہ ہوتے ہیں

(بندۂ خدا)

اِصلاح کرنے والے عناصر

وہ چیزیں جن کی بدولت انسانی زندگی بنتی اور سنورتی ہے، چار عنوانات کے تحت تقسیم ہوتی ہیں۔

(۱) خدا کا خوف، جو آدمی کو برائیوں سے روکنے اور سیدھا چلانے کے لیے ایک ہی قابل اعتماد ضمانت ہے۔ راست بازی، انصاف، امانت، حق شناسی، ضبط نفس اور وہ تمام دوسری خوبیاں جن پر ایک پرامن اور ترقی پذیر تمدن و تہذیب کی پیدائش کا انحصار ہے، اسی ایک تخم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے عقیدوں کے ذریعے سے بھی کسی نہ کسی حد تک انھیں پیدا کیا جاسکتا ہے جس طرح مغربی قوموں نے کچھ نہ کچھ اپنے اندر پیدا کیا ہے۔ لیکن ان ذرائع سے پیدا کی ہوئی خوبیوں کا نشو و نما بس ایک حد پر جاکر رک جاتا ہے اور اس حد میں بھی ان کی بنیاد متزلزل ہی رہتی ہے۔ صرف خدا ترسی ہی وہ پایدار بنیاد ہے جس پر انسان کے اندر برائی سے رکنے اور بھلائی پر چلنے کی صفت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ اور محدود پیمانے پر نہیں بلکہ نہایت وسیع پیمانے پر تمام انسانی معاملات میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

(۲) خدائی ہدایت کی پیروی، جو انسان کے شخصی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی رویے کو اخلاق کے مستقل اصولوں کا پابند کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ جب تک انسان اپنے اخلاقی اصولوں کا خود واضع اور مصنف رہتا ہے اس کے پاس باتیں بنانے کے لیے کچھ اور اصول ہوتے ہیں اور عمل میں لانے کے لیے کچھ اور۔ کتابوں میں آب زر سے وہ ایک اصول لکھتا ہے اور معاملات میں اپنے مطلب کے مطابق بالکل دوسری ہی قسم کے اصول برتتا ہے۔ دوسروں سے مطالبہ کرتے وقت اس کے اصول کچھ ہوتے ہیں اور خود معاملہ کرتے وقت کچھ۔ موقع اور مصلحت اور خواہش اور ضرورت کے دباؤ سے اس کے اصول ہر آن بدلتے ہیں۔ وہ اخلاق کا اصل محور "حق" کو نہیں بلکہ "اپنے مفاد" کو بناتا ہے۔ وہ اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ اس کے عمل کو حق کے مطابق ڈھلنا چاہیے۔ اس کے بجائے وہ چاہتا ہے کہ حق اس کے مفاد کے مطابق ڈھلے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت افراد سے لے

کر قوموں تک سب کا رویہ غلط ہو جاتا ہے اور اسی سے دنیا میں فساد پھیلتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز انسان کو امن' خوشحالی اور فلاح و سعادت بخش سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے کچھ ایسے اصول ہوں جو کسی کے مفاد کے لحاظ سے نہیں بلکہ حق کے لحاظ سے بنے ہوئے ہوں اور انھیں اٹل مان کر تمام معاملات میں ان کی پابندی کی جائے' خواہ وہ معاملات شخصی ہوں یا قومی' خواہ وہ تجارت سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست اور صلح و جنگ سے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اصول صرف خدائی ہدایت ہی میں ہمیں مل سکتے ہیں' اور ان پر عمل درآمد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان ان کے اندر ردوبدل کے اختیار سے دست بردار ہو کر انھیں واجب الاتباع تسلیم کرلے۔

(۳) نظام انسانیت' جو شخصی' قومی' نسلی اور طبقاتی خود غرضیوں کے بجائے تمام انسانوں کے مساوی مرتبے اور مساوی حقوق پر مبنی ہو۔ جس میں بے جا امتیازات نہ ہوں۔ جس میں اونچ نیچ' چھوت چھات اور مصنوعی تعصبات نہ ہوں۔ جس میں بعض کے لیے مخصوص حقوق اور بعض کے لیے بناوٹی پابندیاں اور رکاوٹیں نہ ہوں۔ جس میں سب کو یکساں پھولنے پھلنے کا موقع ملے۔ جس میں اتنی وسعت ہو کہ روے زمین کے سارے انسان اس میں برابری کے ساتھ شریک ہو سکتے ہوں۔

(۴) عمل صالح' یعنی خدا کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے ذرائع کو پوری طرح استعمال کرنا اور صحیح استعمال کرنا۔

یہ چار چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام "بناؤ" اور "اصلاح" ہے اور ہم سب کی بہتری اس میں ہے کہ ہمارے اندر نیک انسانوں کی ایک ایسی تنظیم موجود ہو جو بگاڑ کے اسباب کو روکنے اور بناؤ کی ان صورتوں کو عمل میں لانے کے لیے پیہم جدوجہد کرے۔ یہ جدوجہد اس ملک کے باشندوں کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہوگئی تو خدا ایسا بے انصاف نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی زمین کا انتظام اس کے اصلی باشندوں سے چھین کر کسی اور کو دے دے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ ناکام ہوئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا' آپ کا اور اس سرزمین کے رہنے والوں کا کیا انجام ہوگا۔

کوشش ـ آخری سانس تک!

محمد قطب

ترجمہ: عارفہ اقبال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر قیامت کی گھڑی آجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کی قلم ہو اور وہ اسے زمین میں لگاسکتا ہو تو اسے لگا دینا چاہیے۔اس کو اس پر اجر ملے گا"

اس حدیث سے ذہنوں میں یہ سوال آتا ہے کہ کیا یہ بات کہنے والے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ ؐ لوگوں کو آخرت کی طرف متوجہ کرتے۔اس بڑے ہولناک دن کے لیے تیاری اور تزکیے کی طرف بلاتے جس دن سب لوگ اپنے کیے کا پھل پائیں گے۔آپ ؐ یہ نصیحت کرتے: لوگو جلد از جلد اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔اللہ کے آگے خلوص کے ساتھ جھک جاؤ۔ دعا کرو کہ خاتمہ ایمان پر ہو' اور تم اُخروی زندگی میں فلاح پالو۔جلدی جلدی دنیا کے کاموں سے فراغت پالو اور پوری یکسوئی سے آخرت کی طرف نظریں جما دو۔اللہ کی طرف رخ پھیرلو تاکہ جب اس کے پاس جاؤ تو وہ اپنے رحم وکرم سے تم کو اپنے سائے میں جگہ دے"

اگر رسول ؐ کی نصیحت یہ ہوتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔آخر لوگ جانتے ہیں کہ وہ کشاں کشاں قیامت کی خوفناک گھڑی کی طرف لے جائے جارہے ہیں۔فطری بات ہے کہ وہ ہراس کام کو چھوڑ دیں جو ان کو اس دنیوی زندگی سے جوڑے رکھنے والا ہے اور ایک دہشت زدہ لرزاں و ترساں آدمی کی طرح اس دن پر نظریں جمالیں جس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا اور لوگ تم کو نشے میں نظر آئیں گے' حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہو گا۔اس صورتِ حال میں رسول ؐ کا کام یہی تھا کہ وہ ان کو اطمینان دلاتے کہ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کہ اس کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔تم تو آگے بڑھو' پاک ہو جاؤ اور اس کے آگے عاجزی سے جھک جاؤ۔

رسول ؐ کا یہ شفقت بھرا رویہ 'یہ میٹھی نصیحت و ہدایت' پریشان حال لوگوں کے لیے سکینت کا باعث ہوتی اور وہ مطمئن ہو جاتے۔

لیکن اللہ کے رسول ؐ نے یہ سب نہیں کہا بلکہ وہ عجیب و غریب بات کہی جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی ۔ یہ بات اگرچہ پہلی نظر میں بہت عجیب سی لگتی ہے لیکن فطرت کے عین مطابق ہے اور اپنے اندر بڑی سادگی 'گہرائی اور وسعت رکھتی ہے اور اسلامی طرز فکر و عمل کی پوری طرح وضاحت کرتی ہے ۔ اس سادہ سی بات سے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں ۔

اسلام کی منفرد صفت کے طور پر سب سے پہلی فکر انگیز بات یہ سامنے آتی ہے کہ دنیا اور آخرت کی راہیں دو الگ الگ راہیں نہیں ہیں بلکہ آخرت کا راستہ دنیا ہی سے ہو کے جاتا ہے ۔ اس راہ کا ایک سرا دنیا ہے تو دوسرا آخرت ۔ دنیا اور آخرت میں کوئی اختلاف اور فرق نہیں ہے ۔ عبادت اور دنیا کے کام اسلام کی نظر میں جدا جدا نہیں ہیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ آخرت کا راستہ عبادت اور دنیا کا راستہ کام کے درمیان سے گزرتا ہو ۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں اور عبادت کو عمل سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ زندگی آخری لمحے تک عمل کی دعوت ہے ۔ شاہراہ حیات پر اٹھتے قدموں میں سے آخری قدم بھی کام کرتے ہوئے اٹھے ۔ کھجور کی قلم بو دی جائے اگرچہ وہ گھڑی قیامت قائم ہونے کی ہو ۔ اس طرح نظروں کے سامنے یہ حقیقت لائی جارہی ہے کہ آخرت کو جانے والا راستہ یہی ہے ' اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ۔ انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیں ' ہر زمانے میں کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ آخرت کے لیے عمل کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا سے تعلق توڑ لیا جائے ۔ اگر دنیا کے لیے عمل کیا جائے تو وہ آخرت کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے ۔ دین و دنیا کی اس تفریق نے مادی و عملی زندگی کو روحانی و اخلاقی زندگی سے بالکل الگ کر دیا اور انسانیت ایک کشمکش سے دوچار ہو گئی ۔ جب تک انسانی زندگی کے یہ دونوں پہلو باہم مربوط نہیں ہوں گے اس وقت تک انسان سکون اور امن و آشتی سے زندگی نہیں گزار سکے گا۔

زمانہ قدیم سے دین و دنیا کی یہ تفریق چلی آرہی ہے ۔ کچھ لوگ دنیا ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے اور عبادت و ریاضت میں لگ گئے اور کچھ لوگوں نے دنیا ہی کو اپنا مقصود بنا لیا تاکہ دنیا کے مزے لوٹ لیں ۔ دور جدید کا انسان بھی اسی تفریق کا شکار ہے اور اس کے نتائج بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ ہسٹیریا ' بلڈ پریشر ' اعصابی بیماریاں ' پاگل پن اور خودکشی کی وارداتیں جدید تہذیب کے زیر سایہ بڑھتی جارہی ہیں ۔ یہ اسی تفریق کے اثرات ہیں ۔ نفس اپنی اس فطرت کا تقاضا کرتا ہے جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے یعنی جسمانی خواہشات اور مرغوباتِ نفس کی تکمیل بھی ہو اور عقل و فکر اور

روح کے تقاضے بھی تشنہ نہ رہیں - انسانی وجود میں متضاد اور متعارض رجحانات پائے جاتے ہیں - اگر ان کو منتشر حالت میں چھوڑ دیا جائے تو نفس کشمکش اور اضطراب سے دوچار رہے گا - لیکن اسکے متضاد رجحانات میں ایک وحدت اور ربط پیدا ہو جائے تو پھر یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جاتا ہے - مادہ اور روح کے امتزاج کے ذریعے یہ فانی ذرہ ' ازلی اور ابدی طاقت سے نور حاصل کر کے خود بھڑک اٹھتا ہے -

نفس کے متعارض رجحانات کو یکجا کرنے کا راستہ دنیا اور آخرت کی یکجائی ہے : جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر " (القصص : ۷۷) " اے نبیؐ ' کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں ؟ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انھی کے لیے ہوں گی " (الاعراف : ۳۲) دنیا و آخرت کی اس وحدت کا کامل نمونہ اللہ کے رسولؐ کی اپنی ذات تھی - دنیا میں آپؐ نے جو کام بھی کیا اس کا مقصود اللہ کی رضا اور آخرت کا حصول تھا - آپؐ کا کوئی لمحہ ایسا نہ گزرا جس میں آپ دنیا کے کام اور اہل دنیا کی اصلاح کی کوشش سے غافل رہے ہوں - آپؐ اپنی دعاؤں میں اللہ سے یہی توفیق طلب کرتے تھے کہ بہترین طریقے پر فریضہ رسالت ادا کر سکیں - شب کی خلوت میں عبادت کرتے ہوئے بھی آپؐ یہ نہیں بھولتے تھے کہ آپکی رسالت کا مقصد لوگوں کی ہدایت ہے - آپؐ لوگوں سے کٹ کر اللہ کے لیے یکسو ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے - آپؐ اللہ کی راہ میں لڑے ' اسی کی خاطر صلح کی ' اسی کی طرف لوگوں کو بلایا ' اسی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق شادی کی ' ہجرت کی ' نیا وطن بنایا --- یہ سب اللہ کے لیے ' آخرت کے لیے ' اس دن کے لیے جب اللہ سے ملنا ہو گا ' کیا - اسی لیے آپؐ کا ہر عمل عبادت بن گیا - آپؐ کے سامنے ایک ہی راستہ تھا - اور وہ اللہ کی طرف جانے والا راستہ تھا - اسی پر آپؐ کے قدم زندگی کے آخری لمحے تک بڑھتے چلے گئے - آپؐ دنیا کے کام کرتے تھے لیکن آخرت چاہتے تھے اور اس آخرت کی زندگی کے لیے اس زمین پر جدوجہد کرتے تھے - یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

یہ آپؐ کی زندگی کے اختتام کا اشارہ تھا - لیکن آخری سانس لیتے وقت بھی آپؐ دنیا کے معاملات سے الگ نہ ہوئے - درد شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور آپؐ کہہ رہے تھے کاغذ قلم لاؤ میں تمھارے لیے کچھ ہدایات لکھوا دوں - یہ تھی مجبوری کی قلم جو آپؐ بالکل آخری وقت میں بو رہے تھے !

مسلمان اس نمونے کی پیروی کر کے بھٹکی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ دکھا سکتے ہیں۔ وہ یہ جان لیں کہ جب تک وہ اس دوڑتی بھاگتی زندگی میں دوسروں کے ساتھ حصہ نہیں لیں گے وہ نہ اللہ کو راضی کر سکتے ہیں اور نہ اپنے دین کی خدمت کر سکتے ہیں۔ یہ اسلام نہیں ہے کہ جب وہ اسکول' یونی ورسٹی' کارخانے یا بازار میں داخل ہوں تو یہ سمجھیں کہ وہ دنیا کے کام کر رہے ہیں اور ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد عبادت کریں گے۔ اسلام تو یہ ہے کہ وہ جدید علوم حاصل کر کے لوگوں کی بھلائی کے کام کریں' ایٹمی طاقت کا راز جان کر جنگ و امن میں اس کا صحیح استعمال کریں' بلکہ وہ یہ سمجھ لیں کہ اللہ پر ایمان رکھنے والا انسان دنیا کا جو کام بھی کرے گا وہ آخرت کے راستے سے ہٹ کر نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے راستے ہی سے وہ آخرت تک پہنچیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زندگی کے آخری لمحے تک وہ کھجور کی قلمیں زمین میں بوتے رہیں۔ اسی طرح وہ اللہ کی رضا حاصل کر سکیں گے اور دنیا والوں کو خصوصاً اہل مغرب کو ' بتا سکیں گے کہ تم نے دنیا بنانے کے لیے اللہ کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا ہے حالانکہ وہ تم کو اس زندگی سے لطف اندوز ہونے سے نہیں روکتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تم اس صراط مستقیم پر چلو جو دنیا سے گزر کے آخرت تک جاتی ہے اور تمھیں اللہ تک پہنچانے والی ہے۔

اس حدیث سے دوسرا اہم سبق یہ ملتا ہے کہ زندگی ہے تو مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ نتیجہ کی طرف سے کسی بھی قسم کی مایوسی ایک لحظہ کے لیے بھی کوشش کا سلسلہ منقطع نہ کر سکے۔ قیامت سر پہ آ گئی ہو' اب کسی کام کا کوئی ثمرہ ملنے کا امکان نہ ہو' پھر بھی ہاتھ میں تھامی ہوئی قلم زمین میں لگا دی جائے۔ گویا اس طرح اسلام دنیا کی تعمیر و ترقی کے لیے آخری لمحے تک کوشش کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس چیز کو اللہ اور آخرت کے راستے پر چلنے میں رکاوٹ قرار نہیں دیتا۔ موجودہ مغربی تہذیب کی طرح اسلام میں عمل اور اخلاق کے پیمانے الگ الگ نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان مادی طور پر ترقی کرتا جائے اور اسکے اخلاق زوال پذیر ہوں۔ مسلمانوں نے اللہ کے راستے پر چلتے ہوئے اور اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے دنیا کی بہترین تہذیب کی بنیاد ڈالی اور اس کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچایا۔ انھوں نے انسانیت کے لیے ایسی بہترین مثالیں قائم کیں جن کو پہلے صرف قصے کہانیوں یا خوابوں ہی میں دیکھا جا سکتا تھا۔ حضرت ابو عبیدہ اہل شام سے جزیہ وصول کرتے تھے۔ رومیوں کا لشکر جمع ہوا تو انھیں اندیشہ ہوا کہ اب وہ شامیوں کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔ انھوں نے جزیہ کی تمام جمع شدہ رقم واپس کر دی۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا کے سارے کام ہوتے ہیں' جنگ بھی ہوتی ہے' صلح بھی ہوتی ہے لیکن اس دوران ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ کو بھلایا نہیں جاتا کیونکہ یہ سب اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے۔ صلیبی جنگوں میں صلاح الدین ایوبی کو اپنے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی۔

وہ دشمن جنھوں نے اس سے پہلے مسلمانوں پر ہر طرح کا ظلم و ستم کیا تھا اور بیت المقدس کے اندر ان کا خون بہایا تھا۔ صلاح الدین نے ان کو معاف کر دیا اور کسی قسم کا انتقام نہیں لیا۔ یہ دنیا کے سامنے اسلام کا ایک اور معجزہ ہے۔ دنیا کے کام کرتے رہو لیکن اللہ کو نہ بھولو' دنیا کی راہ ہی آخرت کی طرف جانے والی راہ ہے۔ دراصل یہ مسلمان اپنے رسول ؐ کی پیروی کرتے رہے جو ان کو اس بات پر ابھارتے ہیں کہ آخری سانس تک زمین میں پودے بوتے رہو۔ یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کب پھل دے۔ ان کا کام ہے کہ نئے نئے مقامات پر جائیں اور زمین میں بوئے ہوئے پودوں کی محبت ان کو کسی ایک جگہ سے باندھ نہ دے۔

یہ طرز عمل تھا جس نے دنیا کے اندھیروں میں مسلمانوں کو ایک نور بنا دیا اور وہ دنیا والوں کے لیے راہ نما بن گئے۔ اس وقت یورپ جہالت' پستی اور انتشار کا شکار تھا۔ پھر اسلام کے چمکتے ہوئے نور کی کچھ کرنیں وہاں بھی پہنچیں اور وہ غفلت سے بیدار ہوا۔ لیکن وہ اللہ اور آخرت کے راستے پر نہیں چلا اس لیے اس کی حالت اس مجنوں کی سی ہو گئی جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس کر دیا ہو۔

غفلت میں پڑے ہوئے بے عمل مسلمانوں کو آج رسول اللہ ؐ کی زندگی کو بغور دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی ان کو سبق دیتی ہے 'عمل اور لگاتار عمل کا۔ بغیر رکے بغیر تھکے' جدوجہد کا۔ طاقت سے بڑھ کے کوشش کا' تاکہ ماضی کی بے عملی کا مداوا ہو سکے۔ ان کو ہر میدان میں آگے بڑھنا ہے 'علم و فن ہو یا صنعت و حرفت' تجارت ہو یا اقتصادیات' سیاست ہو یا حکومت' ہر شعبے میں جدوجہد کر کے دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ ان کا کام کوشش کرنا ہے کامیابی یا نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

معاشرے کی اصلاح کرنے اور تبدیلی کی کوشش کرنے والوں کے لیے اس حدیث میں کیا خوب سبق ہے۔ ایسے لوگوں پر مایوسی کے حملے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کو ثابت قدم رہنے کی سب سے بڑھ کے ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تاجر ناکامی سے دل برداشتہ ہوتا ہے لیکن مال کی ضرورت اسے پھر اپنی راہ پر لگا دیتی ہے۔ ایک سیاستدان مایوسی کا شکار ہوتا ہے لیکن سیاست کے نشیب و فراز اسے دوبارہ اس میدان میں کھینچ لاتے ہیں۔ ایک عالم علم تحقیق کی میدان میں ناکام ہو سکتا ہے لیکن دوبارہ کوشش کر کے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن مصلحین کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کا واسطہ مادی چیزوں سے نہیں بلکہ قلب و روح سے ہوتا ہے۔ حق کی دعوت سے لوگوں کا انحراف اور خیر و صلاح کو پہچاننے کے باوجود اس کی مخالفت مصلحین کے دلوں کو ایک گھن کی طرح چاٹتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ مکمل مایوسی کا شکار ہو کے راستے ہی میں گر پڑتے ہیں۔ صرف وہ لوگ اپنی جگہ جمے رہتے ہیں جو قیامت آجانے کا یقین ہو جانے کے بعد بھی زمین میں پودا لگانے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اس لیے مصلحین اللہ کے

رسول ؐ کی اس نصیحت کے سب سے زیادہ محتاج ہیں اور ان کو ہر شخص سے بڑھ کر اس نصیحت کے سادہ الفاظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ حدیث ان کو بتاتی ہے کہ تمھارا کام صرف کوشش کرنا ہے نتیجہ نکالنا تمھاری ذمہ داری نہیں۔ یقین کامل کے ساتھ کام کرو۔ تم اپنے آپ سے یہ سوال نہ کرو کہ یہ پودا بار آور کیسے ہوگا جب کہ ہر طرف آندھیاں اور برائی کے طوفان ہیں۔ اگر تم یہ سوچو گے تو کھجور کی قلم پھینک کے ہاتھ جھاڑ کے کھڑے ہو جاؤ گے اور اس کو ضائع کر دو گے۔ اس کو زمین میں بو دو اور اللہ کے آگے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم سے اس محدود ذمہ داری سے آگے کوئی کردار ادا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ کبھی تم دنیاوی پیمانوں کے لحاظ سے خوش قسمت ہوتے ہو کہ تمھاری زندگی ہی میں تمھارا بویا ہوا پودا پھل پھول لے آتا ہے اور کبھی تم یہ وقت آنے سے پہلے ہی دنیا سے چلے جاتے ہو۔ لیکن تم کہاں جاتے ہو؟ اللہ کے پاس' جہاں تم کو دنیا میں لگائے ہوئے پودے کا پھل مل جاتا ہے۔ اس وقت تم خوش ہو گے کہ تم نے دنیا میں پودا لگا دیا تھا اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ تم کو پھل' چاہے دنیا میں ملے یا آخرت میں' ملے گا ضرور۔

تغیرِ احکام بلحاظ تغیرِ زمانہ و احوال

حافظ ابن قیم

یہ مقالہ علامہ ابن قیم کی حکمتِ دین اور اصولِ فقہ پر مشہور کتاب اعلام الموقعین کا ایک باب ہے۔ اس میں انھوں نے شریعت کے اس اہم اصول پر بحث کی ہے کہ زمان و مکان اور حالات و عادات کے تغیر سے احکام شریعت کی تبدیلی کس طرح، کن مصالح اور کن شرائط و اصول کے تحت رونما ہوتی ہے۔ ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۷ میں پہلی دفعہ سید مودودی نے خود اس کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔ ۲۵ سال بعد' ان ہی کی ہدایت پر مولانا خلیل احمد حامدی مرحوم نے اس کا دوبارہ ترجمہ کیا' جو مئی ۱۹۵۹ میں شائع ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر' ہم دونوں تراجم سے اخذ کر کے' تسہیل و اختصار کے بعد' اسے تیسری بار شائع کر رہے ہیں۔ اعلام الموقعین ج ۳' ص ۱۷ سے اصل بحث کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ (مدیر)

"زمان و مکان کے تغیر' حالات و نیات کے اختلاف' اور عرف و عادت کی تبدیلی سے فتویٰ بدل جاتا ہے اور احکامِ شرعی میں تغیر ہو جاتا ہے"۔ تبدیلی کا یہ اصول بڑا اہم ہے۔ جو لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں' وہ شریعتِ اسلامی کے بارے میں زبردست غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کو ایسی تنگی' مشقت' دقت' اور ناقابل برداشت تکلیف میں ڈال دیا جاتا ہے' جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ صاف معلوم ہے کہ شریعت میں' جو انسانی مصالح کا پورا پورا لحاظ کرتی ہے' اس کی کوئی گنجایش نہیں کہ بندوں پر ایسی تکلیف ڈالی جائے۔ شریعت کی بنیاد حکمت پر ہے۔ وہ بندوں کے دنیوی و اُخروی مصالح کی پوری رعایت کرتی ہے۔ شریعت تو مجسم عدل و مساوات ہے' یکسر رحم و ہمدردی ہے' اور سراسر مصلحت و حکمت ہے۔ اس لیے ہر وہ مسئلہ جو انصاف کے بجائے ظلم و زیادتی کا' سہولت کے بجائے مشقت کا' مصلحت کے بجائے مفسدت کا اور حکمت کے بجائے لغویت کا سبب بن جائے' وہ ہرگز شریعت کا مسئلہ نہیں ہو سکتا' خواہ تاویل و توجیہ کے ذریعے اسے نظامِ شریعت میں زبردستی ٹھونس دیا جائے۔ دراصل شریعت نام ہے انسانوں کے درمیان اللہ

تعالیٰ کی عدل گستری کا' مخلوق کے درمیاں اس کی رحمت و مہربانی کا' روئے زمین پر اس کے سایۂ کرم کا۔ شریعت عبارت ہے اس حکمتِ الٰہی اور تدبیر خداوندی سے جس کی جلوہ نمائیاں' اس کی اور' اس کے رسولوں کی صداقت کا مکمل ثبوت فراہم کر رہی ہیں ۔ وہ شریعت جس کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں' کائنات کی جان' انسانی فلاح کا مدار اور دنیا و آخرت کی سعادت کا مرکز ہے۔

اب ہم تغیر احکام کے اصول کو چند صحیح مثالوں سے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

۱ - منکر کو مٹانے میں حالات کا لحاظ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر یہ واجب کیا ہے کہ منکر سے روکیں اور اسے مٹائیں تاکہ وہ معروف حاصل ہو جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر کسی منکر کی مخالفت اس سے زیادہ بڑا اور خدا اور رسول ؐ کے نزدیک زیادہ ناپسندیدہ منکر پیدا ہوتا ہو تو اس سے روکنا صحیح نہیں ہے' اگرچہ اس کا بھی وجود اللہ کو ناپسند ہو اور اس کا ارتکاب کرنے والے غضبِ الٰہی کو دعوت دیتے ہوں۔ مثلاً امراء و سلاطین کے اندر فسق و فجور دیکھ کر ان کے خلاف جنگ کر لینا صحیح نہیں ہے' کیونکہ یہ چیز فتنوں کی جڑ ہے۔ اس چیز سے قیامت تک کے لیے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ جب صحابہ کرام ؓ نے رسول اللہ ؐ سے ایسے حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت طلب کی جو نماز کو وقت پر ادا نہ کریں' تو آپؐ نے اس سے روکا' اور فرمایا: نہیں' جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں۔ نیز آپؐ نے فرمایا: جو شخص اپنے امیر سے کوئی بُرائی دیکھے تو وہ صبر سے کام لے' اور اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔ اگر تم اسلامی تاریخ میں برپا ہونے والے فتنوں اور مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کے دوران اسلام پر جو کچھ بیتی ہے اس پر غور کرو' تو تم کو معلوم ہو گا' اس کا اصل سبب یہی تھا کہ مذکورہ بالا اصول کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جب منکر کو برداشت نہ کیا گیا' اور اس کو مٹانے کی کوشش کی گئی تو فتنہ و فساد بڑھ گیا۔ اور پہلے سے زیادہ بڑا منکر پیدا ہوا۔

مکہ میں نبی ؐ کی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے منکرات کا ارتکاب ہوتا تھا' مگر آپ ؐ ان کو مٹانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اس لیے خاموش رہتے تھے۔ یہی نہیں' بلکہ جب اللہ نے مکہ کو فتح کرا دیا اور وہ دارالاسلام بن گیا' تو آپ ؐ عمارت کعبہ کو بنائے ابراہیمی پر تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ مگر قدرت رکھنے کے باوجود' آپ ؐ صرف اس اندیشے کی بنا پر رک گئے کہ قریش' جو نئے نئے کفر سے نکل کر اسلام کے دامن میں آ رہے ہیں' اس تبدیلی کو برداشت نہیں کریں گے' اور نتیجہ یہ ہو گا کہ جو خرابی اب موجود ہے اس کی نسبت بڑی خرابی رونما ہو جائے گی۔ اسی اصول کے تحت آپ ؐ نے فاسق و ظالم امرا کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی' کیونکہ اس سے ایسی خرابیاں واقع ہونے کا

اندیشہ ہے جو ان کے شر سے عظیم تر ہوں۔

منکر کی مخالفت کی چار صورتیں ہیں :

۱۔ منکر زائل ہو جائے ' اس کی جگہ معروف قائم ہو جائے۔

۲۔ منکر کو بالکل زائل نہ کیا جا سکے تاہم اس کی شدت میں کمی کر دی جائے۔

۳۔ ایک منکر کو مٹایا جائے مگر اسی درجے کا دوسرا منکر پیدا ہو جائے۔

۴۔ منکر کو مٹانے کی کوشش کے نتیجے میں اس سے بدتر منکر اٹھ کھڑا ہو۔

پہلی دو صورتوں میں نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دینا عین تقاضائے شریعت ہے۔ تیسری صورت میں اجتہاد کے بعد ہی کوئی پہلو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چوتھی صورت میں منکر کے ازالے کی کوشش کرنا حرام ہے۔

مثال کے طور پر 'تم اگر فاسق لوگوں کو شطرنج بازی میں مگن پاؤ تو تم اگر انھیں شطرنج سے روک کر کسی ایسے کھیل میں لگا سکو جو خدا اور رسول ؐ نے پسند کیا ہو' مثلاً تیر اندازی یا اسپ دوانی وغیرہ تو فبہا ورنہ یونہی ان پر تمھارا نکیر کرنا بصیرت و تفقہ کے دیوالیہ پن کی علامت ہوگی۔ اسی طرح ایک جگہ تم دیکھتے ہو کہ فساق کا مجمع ہے 'لہو و لعب ہو رہا ہے یا رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی ہے' تو اگر تم کسی تدبیر سے انھیں اللہ کی عبادت یا فعل خیر کی جانب منتقل کر سکو تو ضرور کرو۔ لیکن اگر یہ نہ کیا جا سکے تو ان کو اس چھوٹے درجے کے فسق میں مبتلا رہنے دینا اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں زیادہ بڑے فسق کے لیے فارغ کر دو۔ کیونکہ وہ چھوٹی برائی ہی ان کو بڑی برائی سے روکے ہوئے ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے تھے کہ فتنۂ تاتار کے زمانے میں ہمارا گزر ایک گروہ پر ہوا' جو شراب و کباب میں مشغول تھا۔ میرے ایک ساتھی نے ان لوگوں کو شراب نوشی سے منع کرنا چاہا' مگر میں نے اس کو روک دیا' اور اس سے کہا کہ بندۂ خدا' شراب اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روکتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کر دیا ہے۔ مگر یہاں شراب ان ظالموں کو بڑے فتنے یعنی قتل نفوس' سلب اموال اور عورتوں اور بچوں پر دست درازی سے روکے ہوئے ہے۔ لہٰذا ان کو ان کے حال ہی پر چھوڑ دو۔

۲ - حدود کے نفاذ میں مصلحت کا لحاظ

نبی ؐ نے جنگ کے موقع پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا ہے (ابو داود) 'حالانکہ قطع ید اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدوں میں سے ایک حد ہے۔ چونکہ جنگ کے دوران حد جاری کرنے میں اندیشہ

ہے کہ مجرم کہیں غصے اور حمیتِ جاہلی سے مغلوب ہو کر کفار و مشرکین سے نہ جا ملے، اور یہ بات خدا کے نزدیک حدود کے معطل یا مؤخر ہو جانے سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ حضرت عمرؓ، ابو الدرداؓ اور حذیفہؓ وغیرہم نے اس حکم کی یہی وجہ بتائی ہے۔ اس بنا پر احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، اوزاعی اور دوسرے ائمہ نے یہ کہا ہے کہ "دشمن کی سرزمین میں حدود اللہ جاری نہ کی جائیں"۔ ابو القاسم خرقی نے بھی اپنی 'مختصر' میں اس اصول کو بیان کیا ہے لیکن ان کے الفاظ یہ ہیں: "دشمنوں کے علاقے میں کسی مسلمان پر حد جاری نہیں کی جائے گی"۔

ایک بار جنگ کے موقع پر ایک فوجی نے بشر بن ارطاۃؓ کی ڈھال چرا لی۔ اسے جب گرفتار کر کے بشرؓ کے سامنے لایا گیا تو انھوں نے فرمایا:

اگر میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے نہ سنا ہوتا کہ "دوران جنگ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں" تو میں ضرور تیرا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (ابو داؤد)

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے افواج کے نام فرمان جاری کیا تھا: "کسی سپہ سالار، کسی سردار دستہ یا کسی مسلمان پر حالت جنگ میں حد نہ جاری کی جائے، تاوقتیکہ وہ اپنے علاقے میں نہ آجائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر حمیت شیطانی کا غلبہ ہو جائے اور وہ کفار سے جا ملے"۔ حضرت ابو الدرداؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے جو روم پر حملہ آور تھا۔ حذیفہ ابن یمانؓ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ولیدؓ بن عتبہ ہمارے سردار تھے۔ انھوں نے وہاں شراب پی لی۔ ہم نے ان پر حد جاری کرنا چاہی مگر حذیفہؓ نے روک دیا، اور کہا: کیا تم اس حال میں اپنے امیر پر حد جاری کرنا چاہتے ہو جب کہ دشمن تمھارے سامنے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم پر دشمن کا حوصلہ بڑھ جائے گا"۔

جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس ابو محجن ثقفی" شراب نوشی کے جرم میں گرفتار ہو کر آئے، اور آپ نے انھیں قید کر دیا۔ جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو ابو محجنؓ نے اسلامی فوج کے حالات دیکھ کر بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھا: "کیسے رنج کی بات ہے کہ دشمن کے نیزے ہمارے گھوڑوں کو پیچھے پھینکتے رہیں اور میں یہاں زنجیروں میں جکڑا ہوا پڑا ہوں"۔ آخر کار ابو محجنؓ نے حضرت سعدؓ کی بیوی سے درخواست کی کہ آپ مجھے کھول دیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ اگر خدا نے مجھے رکھ لیا تو واپس آکر یہ زنجیریں پاؤں میں ڈال لوں گا اور اگر مارا گیا تو جھگڑا ہی چکتا ہو جائے گا۔ حضرت سعدؓ کی بیوی نے ان کے بند کھول دیے۔ انھوں نے حضرت سعدؓ ہی کا گھوڑا لے لیا، جو فارغ تھا کیونکہ وہ اس روز ایک زخم کی تکلیف کی وجہ سے قتال کے لیے نہ

نکل سکے تھے' اور لشکر کفار پر حملہ بول دیا' اور اس قدر دادِ شجاعت دی کہ جس سمت ٹوٹ پڑتے تھے صفیں پلٹ دیتے تھے۔ ان کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ شاید یہ کوئی فرشتہ آسمان سے مدد کے لیے اتر آیا ہے۔ حضرت سعدؓ بھی' جو ایک بلند جگہ بیٹھے جنگی نقل و حرکت کی کمان کر رہے تھے' حیرت کے ساتھ بار بار کہتے تھے کہ جانور کی جاں فشانی بتا رہی ہے کہ بلقا ہے' اور سوار کی شجاعت کہتی ہے کہ ابو محجنؓ ہیں' مگر وہ تو قید میں ہیں! آخر کار دشمن پسپا ہو گئے' اور ابو محجنؓ نے واپس آ کر حسب وعدہ بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعدؓ کی بیوی نے ان کے سامنے یہ سارا قصہ بیان کیا۔ انھوں نے یہ سن کر فرمایا: "خدا کی قسم' میں ایسے شخص کو ہرگز سزا نہ دوں گا جس نے مسلمانوں کی خاطر اس قدر جاں نثاری دکھائی ہے"۔ ابو محجنؓ نے اس فیصلے سے متاثر ہو کر کہا: "جب مجھے کوڑے مار کر پاک کیا جاتا تھا تو میں برابر شراب پیتا رہا۔ اب جب آپ نے میری حد ساقط کر دی ہے تو خدا کی قسم' میں آیندہ اس بلا کو منہ نہیں لگاؤں گا"۔

حضرت سعدؓ کے اس فیصلے میں کوئی بات نص یا قیاس یا اصولِ شریعت میں سے کسی اصل کے خلاف نہیں ہے' نہ اجماع کے مخالف ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے تو زیادہ درست ہو گا۔ چنانچہ شیخ ابن قدامہ المغنی میں رقم طراز ہیں: "یہ متفق علیہ ہے۔ اس سے کسی کا اختلاف ظاہر نہیں ہوا"۔

میرے (ابن قیم کے) نزدیک اقامتِ حد میں یہ تاخیر دو برتر مصالح میں سے کسی ایک مصلحت پر مبنی ہے۔ یہ کہ خود مسلمانوں کو ایک جنگ آزما سپاہی کی خدمات حاصل ہوں گی' یا یہ کہ مجرم کے مرتد ہو جانے اور کفار سے مل جانے کا خطرہ نہ ہو گا۔ عوارض کی بنا پر حد کو موخر کر دینے کی تصریح خود شریعت میں وارد ہے' مثلاً حاملہ عورت کی یا جس عورت کا بچہ دودھ پیتا ہو' اس کی حد ملتوی کر دی جاتی ہے۔ مریض پر حالتِ مرض میں حد جاری کرنا ممنوع ہے۔ سخت گرمی اور سخت سردی کے وقت بھی حد نافذ کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ایک مجرم کے مصالح کو ملحوظ رکھ کر حد مؤخر کی جا سکتی ہے' تو ظاہر ہے کہ مصلحت دین کی خاطر اس کو مؤخر کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سعدؓ نے ابو محجنؓ سے حد ملتوی نہیں کی بلکہ منسوخ ہی کر دی تھی۔ تو کیا حد منسوخ کر دینا جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے: اولاً تو ہمارے لیے حضرت سعدؓ کا یہ عمل قابل حجت نہیں ہے' (کہ اس سے تنسیخ حد کا اصول قائم کر لیا جائے)۔ اور ثانیاً یہ کہ جو لوگ حضرت سعدؓ کے قول سے استشہاد کرتے ہیں وہ بھی اس سے صرف اتنا استنباط کرتے ہیں کہ دارالحرب میں مسلمان پر حد واجب نہیں ہے' جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد ؓ نے اس معاملے میں سنت اللہ کی پیروی کی ہے - چنانچہ حضرت سعد ؓ نے جب ابو محجن ؓ کے اندر دین کے لیے غیر معمولی فداکاری ' جہاد کا جذبہ اور جاں نثاری کا شوق موجزن دیکھا ' تو ان کی حد کو ساقط کر دیا - اس لیے کہ ابو محجن ؓ سے جن نیکیوں کا صدور ہوا - وہ ان کی ایک بدی پر چھا گئیں ' اور اس کی مثال اس قطرۂ نجاست کی سی ہو گئی جو سمندر میں تحلیل ہو گیا - علاوہ ازیں میدان کارزار میں حضرت سعد ؓ نے بچشم خود ابو محجن ؓ کی سچی توبہ کے آثار دیکھ لیے - یہ وہ وقت تھا جب کہ کسی مسلمان کے متعلق یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسے کڑے وقت میں بھی جب کہ موت سامنے دیکھ رہا ہو اور ہر لمحے دربارِ الٰہی میں حاضری کا گمان ہو ' اپنے گناہ پر اصرار کرے گا - پھر جس طرح کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو حوالے کر کے ' اپنے پاؤں میں برضائے خود بیڑیاں ڈال لیں ' اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ فی الواقع اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی حد کو معاف کر دیا جائے -

۳ - اجرائے احکام میں حکمت

خود نبی کریم ؐ سے اس قسم کی رعایتیں ثابت ہیں :

(۱) ایک شخص نے نبی کریم ؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا : یارسول اللہ ' میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں ' مجھ پر حد جاری فرمایئے - آپ ؐ نے پوچھا : کیا تم نے ابھی ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے ؟ اس نے عرض کیا : جی ہاں - فرمایا : جا اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا - اس درگذر اور دفع حد کی برکت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس نے صدق دل سے توبہ کر لی ' اور وہیں اعلان کر دیا " خدا کی قسم میں آیندہ ہرگز (اور دوسری روایت میں ہے ابد الآباد تک) شراب نہیں پیوں گا " - ایک اور روایت میں ہے ' اس نے کہا : " تمھارے کوڑوں کے خوف سے میں شراب چھوڑنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا - جب تم نے مجھ کو چھوڑ دیا ہے تو خدا کی قسم ! میں آیندہ شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا -

(۲) حضرت خالد ؓ نے قبیلہ بنی جذیمہ کے ساتھ جو نامناسب کارروائی کی تھی اس کا علم جب رسول اللہ ؐ کو ہوا تو آپ نے صرف اتنا فرمایا : (اے اللہ ' جس فعل کا ارتکاب خالد نے کیا ہے میں تیرے حضور اس سے اظہار برأت کرتا ہوں) اس سے زیادہ حضور ؐ نے ' حضرت خالد ؓ کی عمدہ صلاحیتوں ' خدماتِ جلیلہ اور نصرتِ اسلام کا پاس کرتے ہوئے ' ان کا کسی قسم کا مواخذہ نہیں فرمایا -

یہ اصول بڑی اہمیت و افادیت کا حامل ہے ' اور اس باب میں تفقہ کا دروازہ اسی پر کھلے گا جو امر و نہی اور ثواب و عقاب کے باہمی ربط و مطابقت کا گہرا مطالعہ کرے گا - جس طرح اللہ تعالیٰ تائب کو عذاب نہیں دیتا ' اسی طرح تائب پر حد بھی نہیں قائم کی جاتی - چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے واضح حکم کے

ذریعے ان محاربین اور مفسدین پر سے حد ساقط کر دی ہے جو مسلمانوں کے قابو میں آنے سے پہلے توبہ کر لیں۔ جب اس قدر سنگین جرم کی سزا توبہ و رجوع الی اللہ سے معاف ہو سکتی ہے تو محاربہ و فساد سے کم تر جرم کی سزا توبہ و انابت سے بدرجہ اولیٰ معاف ہونی چاہیے۔

(۳) نسائی کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ ایک عورت اندھیرے منہ صبح کی نماز کے لیے مسجد کی طرف نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو پکڑ لیا اور اس کی عصمت دری کرنے لگا۔ عورت نے شور مچانا شروع کر دیا، اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو مدد کے لیے پکارا۔ وہ جب آیا تو مجرم بھاگ گیا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑا۔ اتنے میں کچھ اور لوگ آگئے، اور عورت نے ان سے بھی فریاد کی۔ وہ بھی فوراً مجرم کی تلاش میں دوڑے۔ مجرم تو کہیں آگے نکل گیا، مگر انھوں نے اسی شخص کو پکڑ لیا جو خود عورت کی مدد کو نکلا تھا۔ یہ اس کو پکڑ کر عورت کے پاس لے آئے۔ اس نے کہا میں تو اس کی مدد کو لپکا تھا، جس شخص نے دست درازی کی ہے وہ بھاگ گیا ہے۔ مگر کسی نے اس کی نہ سنی۔ آخر کار وہ لوگ اسے نبی کریم ؐ کی خدمت میں لے آئے۔ عورت نے حضور ؐ سے عرض کیا کہ یہی شخص ہے جس نے میرے اوپر حملہ کیا تھا۔ لوگوں نے بھی کہا کہ ہم نے اس شخص کو بھاگتے ہوئے پکڑا ہے۔ اس شخص نے حضور ؐ کے سامنے صورت واقعہ پیش کی۔ عورت نے کہا: یہ جھوٹ کہتا ہے اسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ آخر کار حضور ؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اسے لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔ اس پر مجمع میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا: اس کو سنگسار نہ کرو، مجھے سنگسار کرو۔ یہ فعل مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ اب تینوں فریق رسول اللہ ؐ کے سامنے تھے: ایک، جس نے عصمت دری کی، دوسرا، جو عورت کی مدد کے لیے بڑھا تھا، اور تیسری خود عورت۔ آپ ؐ نے اقبال جرم کر لینے والے سے فرمایا: جا، تجھے تو اللہ نے معاف کر دیا۔ دوسرے شخص کے حق میں کلمہ تحسین فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ؐ، زنا کا اعتراف کر لینے والے کو تو رجم کی سزا دیجیے۔ مگر آپ ؐ نے انکار کیا، اور فرمایا: اس نے اللہ سے توبہ کر لی ہے۔

اس واقعے کو بیان کرنے کے بعد امام ابن قیم نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ حضور ؐ نے جرم کے ثبوت یا اعتراف کے بغیر عورت کے مددگار کو کیوں رجم کا حکم جاری فرما دیا تھا۔ امام موصوف نے حضور ؐ کے اس فیصلے کی فوجداری مقدمات میں قرائن اور ظاہری حالات کی شہادت کے اعتبار و استناد کی سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے۔ بلکہ انھوں نے مذکورہ واقعہ کی تمام جزئیات پر قانونی نقطہ نظر سے بحث کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ آنحضور ؐ کا فیصلہ بالکل درست اور قانون کے تقاضے پر مبنی ہے۔ دلائل کے آخر میں لکھا ہے:

اس مقدمے میں بحمدللہ کوئی اشکال نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ رسول للہ ؐ نے بغیر شہادت اور بغیر اقرار کے پہلے شخص پر رجم کا فیصلہ کیسے صادر فرمایا' تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ؐ کا یہ فعل اس بات پر نہایت قوی دلیل ہے کہ تہمتوں میں قرائن کا اعتبار کرنا اور شواہد احوال پر رائے قائم کرنا جائز ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ شراب نوشی کے جرم میں منہ کی بو اور قے پر اقامت حد کا فیصلہ کیا جاتا ہے' جیسا کہ صحابہ ؓ کا اجماع ہے۔ زنا کے جرم میں حمل کی شہادت کو اقامت حد کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے' جیسا کہ حضرت عمر ؓ نے فیصلہ کیا ہے اور فقہائے اہل مدینہ کا مذہب ہے۔ اسی طرح جس پر سرقہ کی تہمت ہو اگر اس کے قبضے سے مال مسروقہ برآمد ہو جائے تو یہ اقامت حد کے لیے کافی شہادت ہے۔

قرائن و شواہد سے جو گمان غالب حاصل ہوتا ہے وہ اس گمان غالب سے کچھ کم نہیں ہے جو شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔ شہادت میں بھی غلطی کا احتمال یا گواہوں کی دشمنی کا احتمال ویسا ہی ہے جیسا کہ اس معاملے میں غلط فہمی یا عورت کی عداوت کا احتمال ہے بلکہ یہاں اس گمان کی بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ عورت نے دشمنی کی بنا پر اس شخص کو متہم کر دیا ہوگا۔ غرض یہ کہ اس مقدمے میں ظاہری قرائن و شواہد اتنے مضبوط ہیں کہ اس درجے کے قرائن و شواہد ثبوت حد کے لیے شرعاً کافی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بہت سے مواقع پر اس سے بھی کم درجے کے قرائن و شواہد کو فیصلے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ ایک عمدہ نظیر ہے۔ ظاہری احکام ہمیشہ ظاہری دلائل مثلاً شہادت اور اقرار اور شواہد احوال کے تابع ہوتے ہیں' اور ان کا کبھی کبھی نفس الامر کے خلاف ہونا کوئی ایسا امر نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ عدالتی فیصلوں کے لیے یہ طریقے اور وسائل کافی نہیں ہیں۔ خود شہادت بھی تو بالذات موجب حد نہیں ہے۔ بلکہ حد کے ساتھ اس کا رابطہ وہی ہے جو مدلول کے ساتھ دلیل کا رابطہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی دلیل اس کے خلاف برابر کی قوت رکھتی ہو' یا اس سے زیادہ قوی ہو' تو شارع کی نگاہ میں وہ ناقابل التفات نہیں ہے۔

رہا اقراری مجرم سے حد کا اسقاط' تو جب امیرالمومنین عمر بن خطاب ؓ جیسے شخص کا دامن عفو اس کے لیے وسیع نہ ہو سکا' تو کوئی تعجب نہیں اگر فقہا کی کثیر تعداد کا دامن عفو بھی اس کے لیے وسیع نہ ہو' لیکن رؤف و رحیم ہستی کے دامن عفو میں اس کے لیے جگہ تھی۔ اس لیے آپ ؐ نے فرمایا کہ "یہ اللہ سے توبہ کر چکا ہے" اور سزا دینے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ بے شک اصل مجرم نے برضا و رغبت اعتراف جرم کر کے اور اپنے آپ کو سنگساری کے لیے پیش کر کے جس نیکی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف اللہ ہی کی خشیت سے صادر ہو سکتی تھی۔ اس کا ایک مسلمان کو موت کے منہ سے بچا لینا اور اپنی زندگی پر اپنے بھائی کی زندگی کو ترجیح دینا' اور اپنی ذات کو خود ہلاکت کے لیے پیش کر دینا' یہ اتنی بڑی نیکی تھی کہ اس

کے مقابلے میں زنا کا گناہ ہلکا ہو گیا۔ نیکی کی طاقت ور دوا سے برائی کا مرض زائل ہو گیا' اور اس کا قلب جو عارضی طور پر بیمار ہو گیا تھا' پھر صحت مند ہو گیا۔ عدالت نبوی سے اسے یہ فیصلہ دے دیا گیا کہ اب ہم حد نافذ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے' کیونکہ حد اسی لیے ہے کہ آدمی کو پاک کرے۔ جب تو سزا کے بغیر ہی طاہر و پاک ہو گیا ہے تو اب تیرا مقام رجم گاہ نہیں' ہمارا دامن عفو ہے! سبحان اللہ' کون سا فیصلہ اس فیصلے سے بہتر ہو گا۔ جو رحم دلی سے بھی بھر پور ہے اور حکمت اور مصلحت کے بھی مطابق ہے۔

(۴) نسائی کی ایک اور روایت میں ایک ایسے شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جس نے حضور ؐ کے سامنے آکر اقرار کیا کہ وہ حد کا مستحق ہے۔ حضور ؐ نے تین بار اس کو ٹال دیا' پھر نماز کھڑی ہو گئی۔ اس نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حضور ؐ نے اس کی نماز کو بنیاد بنا کر فرمایا: جا' اللہ نے تجھے معاف کر دیا۔ اس باب میں تین مسلک ہیں: ایک وہ جو نسائی نے ترجمۃ الباب میں لکھا ہے کہ "جس نے حد کا اعتراف کیا' اور اس کا نام نہ لیا"۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ معافی اس شخص کے لیے خاص تھی۔ تیسرا یہ ہے کہ پکڑے جانے سے پہلے جو توبہ کرے اس پر حد ساقط کر دی جائے۔ یہی صحیح ترین مسلک ہے۔

حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں چور کے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا منسوخ کر دی تھی' اور فرمایا تھا: "کھجور کی چوری اور قحط سالی میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں"۔ امام احمد بن حنبل نے بھی یہی فرمایا: "اگر زمانہ خشک سالی کا ہو اور لوگوں پر سختی گزر رہی ہو' اور ایسی حالت میں کوئی شخص حاجت سے مجبور ہو کر چوری کرے' تو میں اسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا"۔

حضرت عمرؓ نے حاطب کے غلاموں کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی اس رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ حاطب کے غلاموں نے قبیلہ مزنیہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرا لی' مگر گرفتار ہو گئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے انھوں نے چوری کا اعتراف کر لیا۔ آپ ؓ نے حاطب کے بیٹے عبدالرحمن کو بلا کر واقعہ کی اطلاع دی' اور کثیر بن الصلت کو غلاموں کے ہاتھ کاٹ لینے کا حکم دیا۔ جب وہ غلاموں کو سزا کے لیے لے چلے تو آپ کو فوراً تنبہ ہوا' اور انھیں روک دیا' اور فرمایا: "تم لوگ ان غریبوں سے کام لیتے ہو' مگر ان کو بھوکا مار دیتے ہو اور اس حال تک پہنچا دیتے ہو کہ اگر ان میں سے کوئی حرام چیز بھی کھا لے تو اس کے لیے جائز ہو جائے۔ خدا کی قسم' اگر میں یہ نہ جانتا ہوتا تو ضرور ان کے ہاتھ کاٹ دیتا۔ مگر اب ان کے ہاتھ کاٹنے کے بجائے تم پر ایسا تاوان ڈالوں گا کہ تمھارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے"۔ اس کے بعد آپ نے مزنی سے اونٹنی کی قیمت دریافت کی۔ اس نے چار سو درہم بتائی۔ آپ نے غلاموں کے مالکوں کو حکم دیا: "اسے آٹھ سو درہم

ادا کرو"۔ امام احمد بن حنبل نے ان دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ کا مسلک اختیار کیا ہے۔
امام اوزاعی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ رائے سراسر قیاس اور اصول شریعت کے تقاضے پر مبنی ہے۔ اگرچہ شریعت کا صریح حکم یہ نہیں ہے۔ کیونکہ جب کال پڑ جاتا ہے اور فقر و فاقہ عام ہو جاتا ہے ' تو یہ بعید نہیں ہے کہ کسی نے جان بچانے کی خاطر مجبوراً چوری کی ہو۔ دوسری طرف ' ایسے حالات میں خود صاحب مال کا بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ محتاج کی ضرورت بالعاوضہ یا بلامعاوضہ پوری کرے۔ اس بارے میں اگرچہ اختلاف ہے ' لیکن صحیح قول یہی ہے کہ بلامعاوضہ ضرورت کو پورا کرے۔ اس لیے کہ اسلام نے ہر شخص پر یہ واجب ٹھہرایا ہے کہ استطاعت ہو تو انسانی جانوں کو بچائے اور ضرورت سے زائد مال کو محتاج پر صرف کرے جب کہ وہ ابتدائی لوازم زندگی سے بھی تنگ ہو۔
فقہا نے حد سرقہ ساقط کر دینے کے لیے جن اسباب کو مؤثر و معتبر گردانا ہے ' قحط سالی اور فقر و فاقہ کے غلبے کا وجود ساقط حد کے لیے ان تمام اسباب و شبہات و احتمالات سے زیادہ قوی اور قابل لحاظ ہے جن کو ارباب فقہ و قانون تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ زمانہ قحط میں حاجت مندوں اور بھوکوں کی کثرت ہوتی ہے ' اور یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون مستغنی ہے اور بلاوجہ چوری کرنے والا ہے اور کس نے ضرورت سے مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ اس سے یہ امر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ کون درحقیقت حد کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے ' لہٰذا سب پر سے حد ساقط کر دی جاتی ہے۔ البتہ جب یہ صاف واضح ہو جائے کہ چوری کرنے والے کو واقعی اس غلط اقدام کی ضرورت نہ تھی تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹا جائے گا۔

۴۔ احکام کی تعبیر میں عرف و عادت کا لحاظ

(ا) نبی ؐ نے صدقہ فطر میں کھجور ' جو ' کشمش اور پنیر کا ایک صاع واجب فرمایا ہے۔ آپؐ کے زمانے میں اہل مدینہ کی یہی عام غذائیں تھیں۔ لیکن اگر کسی شہر یا بستی کے باشندوں کی غذا ان سے مختلف ہو ــــ مثلاً وہ مکئی یا چاول یا انجیر یا از قسم اناج کوئی اور چیز کھاتے ہوں تو وہ اسی میں سے ایک صاع ادا کریں گے۔ بلکہ اگر کسی آبادی کی عام غذا اناج نہ ہو ' بلکہ دودھ ' گوشت ' مچھلی وغیرہ ہو ' تو بہرحال جو غذا بھی ہوگی اسی میں سے وہ صدقہ فطر ادا کرنے کے مکلف ہوں گے۔ جمہور علما کا یہی مسلک ہے ' اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ شارع ؑ کا اصل منشا یہ ہے کہ عید کے روز غربا اور مساکین بھوکے نہ رہ جائیں ' اور لوگ جو کچھ خود کھاتے ہوں اسی سے غریب بھائیوں کی بھی خبرگیری کریں۔ اس لحاظ سے غلہ کے بجائے آٹا بھی صدقہ فطر میں دے دینا کافی ہو گا ' اگرچہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ رہا پکے ہوئے طعام کو صدقہ میں دینا ' تو اگرچہ ایک لحاظ سے یہ غربا و مساکین کے لیے زیادہ مفید ہے کیونکہ انھیں پکانے کی زحمت و مشقت نہیں اٹھانا پڑے گی لیکن دوسرے لحاظ سے خشک اناج ان کے لیے زیادہ

کار آمد ہے' کیونکہ ایک تو وہ دیر تک باقی رہ سکتا ہے اور دوسرے اناج سے جو ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں وہ پکے ہوئے طعام سے نہیں کی جاسکتیں۔ بالخصوص جب غربا کے گھر میں پکا ہوا طعام کثیر مقدار میں جمع ہو جائے گا' تو ان کے لیے اسے محفوظ کرنا ناممکن ہو گا اور بیشتر ضائع ہو جائے گا۔

(۲) نبی کریم ؐ نے حکم دیا کہ جس بکری کے تھنوں میں دودھ جمع ہو' اور اس کو کوئی شخص خرید کر دودھ نچوڑے' اور پھر بکری کو ناپسند کر کے واپس کرے' تو اس دودھ کے عوض جو اس نے نچوڑا ہے ایک صاع کھجور بکری کے مالک کو دے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے' حتیٰ کہ ان ملکوں میں بھی جہاں کھجور نہیں ہوتی بلکہ جہاں کے لوگوں نے کھجور دیکھی بھی نہ ہو' وہاں ایک صاع کھجور کی قیمت دے دی جائے' لیکن اگر کوئی شخص اپنے ملک کے غلات میں سے کوئی چیز ایک صاع دے' تو وہ کافی نہ ہو گا۔ اکثر شافعیہ اور حنابلہ کا قول یہی ہے۔ انھوں نے دودھ کی جزا میں کھجور دینے کو عبادات میں داخل کیا ہے' اور اس میں وہ لفظ نص کی پیروی واجب سمجھتے ہیں۔

دوسرے علما کہتے ہیں کہ جس جگہ کھجور کے بجائے کچھ اور چیزیں غذا میں استعمال کی جاتی ہوں' وہاں انھی چیزوں میں سے کوئی چیز بقدر یک صاع دی جائے مثلاً جہاں گیہوں کا رواج ہو وہاں گیہوں اور جس کے پاس کشمش ہوں وہ کشمش۔ لاریب کہ یہی بات شارع ؐ کے مقصود سے اقرب ہے۔

(۳) ایسا ہی حکم ان تمام معاملات میں ہے جن میں شارع ؐ نے کسی خاص چیز کو کسی مقصد کے لیے متعین کیا ہو' اور اس مقصد کے لیے کوئی دوسری چیز ہر حیثیت سے اس شے خاص کی قائم مقام ہو سکتی ہو' یا کسی حیثیت سے اس کے مقابلے میں اولیٰ ہو۔ مثلاً حضور ؐ نے استنجا کے لیے پتھر تجویز فرمایا' مگر پتھر کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اصل مقصد جس طرح پتھر سے حاصل ہوتا ہے' اس سے زیادہ بہتر طریقہ سے کپڑے اور روئی اور اون سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بدرجہ اولیٰ جائز ہونے چاہییں۔ اسی طرح جس چیز کو کتے کا لب لگ جائے اسے دھونے کے لیے آنحضرت ؐ نے مٹی تجویز کی ہے۔ مگر مٹی کی خصوصیت نہیں ہے' راکھ اور کھلی اور ایسی ہی دوسری چیزیں بھی پاک کرنے کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔ غرض یہ کہ جن معاملات میں شارع کا مقصود ہم کو معلوم ہو اور اس مقصود کو شارع کی تجویز کردہ چیز کے مانند دوسری چیزوں سے حاصل کیا جاسکتا ہو تو وہ اس کی قائم مقام ہو سکتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جو ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے اور ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے،
وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ٹیم ورک کے اصول اور طریقے

محمد بشیر جمعہ

ٹیم کی ضرورت

درج ذیل چند حالات اور مواقع ایسے ہیں جہاں ٹیم بنا کر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔ جہاں انتظامیہ اور عمومی قیادت غیر مؤثر ہو گئی ہو۔

۲۔ جہاں مفلوج اور فرسودہ طریقے اور ٹیکنالوجی رائج ہو۔

۳۔ جہاں اخراجات مسلسل بڑھ رہے ہوں کارکردگی اور پیداوار کم ہو رہی ہو۔

۴۔ جہاں کام اور پیداوار میں اضافہ نہ ہو رہا ہو' اور محنت اور خرچ سے حاصل ہونے والے نتائج اور منافع میں کمی آ رہی ہو۔

۵۔ جہاں اداروں میں اہم تبدیلیوں کی ضرورت ہو۔

۶۔ جہاں پیداوار' افادیت اور معیار کی بلندی کی ضرورت ہو۔

۷۔ جہاں کارکنوں میں گھٹن بڑھ رہی ہو' احساس تحفظ کم ہو رہا ہو اور غیر حاضریوں کا رجحان بڑھ رہا ہو۔ جھگڑے اور تنازعات پیدا ہو رہے ہوں۔

ٹیم کی قسمیں

ہم آسان الفاظ میں ٹیم کی دو قسمیں کریں گے: رسمی' اور غیر رسمی۔

۱۔ غیر رسمی ٹیم: اسے آپ ورک ٹیم کہہ سکتے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک ماحول اور اسپرٹ اور جذبے سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ کسی اجتماعی مقصد کے حصول کے لیے آپس میں کام کرتے ہوئے' افراد کا ٹیم اسپرٹ کے ساتھ کام کرنے کا نام ہے۔ ایک ہی شعبے میں ایک سے زیادہ ٹیموں کی تشکیل ممکن ہوتی ہے۔ عموماً یہ مسلسل کام کرتی ہیں اور طویل المیعاد ہوتی ہیں۔

ممبران کی تعداد دس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ آپس کا کھچاؤ' اندرونی سیاست' منافرت اور سخت

برتاؤ ہو تو ٹیم کی تعمیر اور تشکیل میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ان سے اجتناب ضروری ہے۔یہاں ٹیم کی تشکیل میں افراد کو ٹھونسا نہیں جاتا بلکہ ان کی اہلیت اور صلاحیت کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔بعض اوقات افراد کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شعبے کی مختلف ٹیموں میں سے کسی ایک میں شامل ہو سکیں۔خواہاں افراد کا تفصیلی انٹرویو لیا جاتا ہے' انھیں مجوزہ ٹیم کے امور اور ذمہ داریوں کی تفصیلات سے آگاہ کرایا جاتا ہے' موقع محل دکھا دیا جاتا ہے' سوچنے کے لیے وقت دیا جاتا ہے' خاندان کے افراد سے مشورے کی گنجایش رکھی جاتی ہے' اور آخر میں مجوزہ ٹیم لیڈر کے مشورے سے فرد کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

ورک ٹیم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے شرکا میں افہام و تفہیم ہو' یکساں تجربہ ہو' ماضی میں ساتھ کام کرنے کا تجربہ ہو اور غیر ضروری حجاب نہ ہو۔

۴۔ رسمی ٹیم : اسے ہم ٹاسک ٹیم کا نام دیں گے۔یہ عموماً تکمیل 'متعین مدت کے لیے ہوتی ہے' اور کسی متعین مسئلے کے حل کے لیے یا کسی متعین منصوبے پر عمل درآمد کے لیے تشکیل دی جاتی ہے۔اس ٹیم میں مختلف شعبوں سے متعلقہ افراد کام کرتے ہیں۔اس میں وہ فرد لیا جاتا ہے جس کی حصول مقصد کے لیے ضرورت ہو۔اس میں ہر حلقہ اثر کی نمایندگی بھی ضروری ہے۔اس کی تعداد بھی دس سے تجاوز نہ کرے۔بعض اوقات لوگ اپنے آپ کو پیش بھی کرتے ہیں۔تمام ممبران پرعزم ہوں۔اس ٹیم کی حیثیت محض مشاورتی نہ ہو بلکہ فیصلہ کرنے کے اختیارات بھی ہوں۔اس کے لیے مضبوط' موثر اور ہر دلعزیز لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔

شرکاٹیم کی خصوصیات

ٹیم ورک کی کامیابی کے لیے شرکا میں مندرجہ ذیل خصوصیات مطلوب ہیں :

۱۔ عزم اور جذبہ : ٹیم کے ہر ممبر میں عزم اور جذبہ کی ضرورت ہے۔شرکت کا شوق اور احساس ضروری ہے۔فائلیں لیے' چائے پیتے' پان کھاتے اور سگریٹ پیتے ہوئے' اور اونگھنے والے لوگوں کی ضرورت نہیں۔وہ لوگ مفید ہوتے ہیں جو کچھ کام کرنے کا شوق رکھتے ہوں اور ہوم ورک کر کے آتے ہوں' محض رسمی شرکت کے قائل نہ ہوں۔ایسے لوگوں کو' جو باصلاحیت ہوں مگر محنت اور شرکت کے قائل نہ ہوں' ٹیم میں شامل کرنا' اچھے اور کارآمد لوگوں کی کارکردگی کو نقصان پہنچاتا ہے۔

۲۔ باہمی رابطے اور افہام و تفہیم کی صلاحیت : ٹیم کے افراد میں ایک دوسرے سے اس کی حیثیت اور مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے گفتگو اور رابطہ کی صلاحیت ضروری ہے۔ان افراد میں ایک دوسرے کو سننے' سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت ہونی ضروری ہے۔جن افراد میں اس صلاحیت کی کمی ہو

انھیں مناسب تربیت کے کورسز کے ذریعے آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

۳-پس منظر کی اہلیت : کسی مسئلے کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ ہر چیز اور ہر معاملے میں صرف اپنے نقطہ نظر اور مفاد کو دیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ اجتماعی مفاد پیش نظر رہنا چاہیے۔اس سلسلے میں اجتماعی مفاد کی خاطر انفرادی رائے اور مفاد کی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

ٹیم کی کامیابی کی حکمتِ عملی

ٹیم کو قائم کرنا' اسے چلانا اور اس سے مطلوبہ فوائد حاصل کرنا' ایک آرٹ ہے۔اس سلسلے میں شریک میں یہ لچک ہونی چاہیے کہ وہ ٹیم ٹیکنک اور خصوصیات کو اپنانے کی کوشش کرے۔ٹیم ورک میٹنگ میں ہوتا ہے' اس لیے اس کی کامیابی کے لیے میٹنگ کی کامیابی ناگزیر ہوتی ہے۔کامیاب میٹنگ کے چند اصول و ضوابط ہیں جو اختصار سے بیان کیے جارہے ہیں۔

میٹنگوں کی تعداد اور دورانیہ

غیر رسمی ٹیموں کی میٹنگ روزانہ دس منٹ کے لیے بھی ہوسکتی ہے' اور ہفتے میں صرف نصف گھنٹے کے لیے بھی۔بہرحال میٹنگ کی مدت اور معیار جو کچھ بھی ہو' باقاعدگی سے ہو' اس کا اپنا معمول ہو' وقت کی پابندی اور مقدار طے ہو (یعنی مقررہ وقت سے زائد نہ ہو) اور اپنے کام کے علاقے میں ہو۔پلانٹ اور اسمبلی لائن پر ہوسکتی ہے۔سربراہ کے کمرے میں رکھی جاسکتی ہے۔ غیر رسمی ٹیم کے ذریعے متعلقہ شعبے کے افراد اپنی کارکردگی بڑھانے اور متعینہ اہداف کے حصول کے لیے کوشش کرتے ہیں۔

رسمی ٹیم' اہم مسائل کے حل کے لیے تشکیل دی جاتی ہے۔یہ باقاعدگی سے وقفوں کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے اور ایک ہی نشست میں گفتگو کر کے 'فیصلے کر کے بھی مکمل کی جاسکتی ہے۔اس ٹیم کے اجلاس ایسی جگہ ہونے چاہئیں جو کسی بھی شریک کا دفتر نہ ہو۔بہتر تو یہ ہے کہ کسی کانفرنس روم میں یا آزاد ماحول میں ہو۔لوگ اور ٹیلی فون مداخلت نہ کریں اور تیزی کے ساتھ کام نمٹ جائے۔

کامیاب میٹنگوں کا طریقِ کار

(۱) ایجنڈا ہر شریک کو پہلے سے پہنچا دیجیے۔اس میں متعلقہ امور پر غور کے لیے اشارات درج ہوں۔

(۲) میٹنگ چلانے کے لیے اپنے اصول لوگوں کو ابتدا ہی میں بتا دیں۔

(۳) ہر فرد کی حاضری اور گفتگو میں شرکت ضروری ہے۔ اس کا اہتمام کیجیے۔

(۴) ہر فرد کی رائے کا احترام کیجیے ' اور اس کے احساس کو وزن دیجیے۔

(۵) مقصد اور اصل ایجنڈے کی طرف توجہ رکھنا ضروری ہے۔ واقعات ' لطائف ' یا شعر و شاعری کے ذریعے مجلس کو لوٹنے کی ضرورت نہیں۔ 'کام سے کام رکھو' پیش نظر رہے۔

(۶) اختلافی امور کو نظر انداز یا مسترد نہ کیجیے بلکہ محسوس کیجیے اور ان کا تجزیہ کیجیے۔

(۷) میٹنگ میں ہر فرد اپنا نقطہ نظر ہی پیش کرنے نہ بیٹھ جائے بلکہ حقائق کا تجزیہ ضروری ہے۔

(۸) ہیر پھیر کے ذریعے گفتگو نہ کیجیے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ کہیں "صاف چھپتے بھی نہیں ' سامنے آتے بھی نہیں"۔

(۹) اپنے دلائل ' حقائق اور خیالات پر پیش کیجیے ' شخصیات پر نہیں۔

(۱۰) شخصی حملوں سے پرہیز کیجیے۔ عزت تو جانور کو بھی بہت پیاری ہوتی ہے ' آپ خیال رکھیے۔

(۱۱) دوسروں کی گفتگو میں خواہ مخواہ کی مداخلت نہ کیجیے۔

(۱۲) میٹنگ کے دوران ذاتیات ' تعصب اور انا کی جنگ کو مت لائیے۔

(۱۳) جو گفتگو ہو رہی ہو اسے بڑے چارٹ یا بورڈ پر تحریر کرتے رہنا چاہیے اور بعد میں اسے کاغذ پر منتقل کر کے شرکا میں تقسیم کر دینا چاہیے۔

(۱۴) طے شدہ امور پر عمل درآمد کا جائزہ لیجیے۔

(۱۵) ہر ایک اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کرے اور اصلاح کے لیے تجاویز طلب کرے۔ دیکھیے ترقی کی راہیں کس قدر کھلتی ہیں۔

(۱۶) احساس اور گھٹن پیدا ہو تو اسے محسوس کیجیے۔

(۱۷) وقفوں کے ساتھ میٹنگ کی افادیت اور پیش رفت کا جائزہ لیجیے اور افراد کو تنقید کا موقع دیجیے۔

دوران میٹنگ ٹیم لیڈر کا کردار

ٹیم لیڈر مندرجہ ذیل باتوں کو پیش نظر رکھے۔

۱۔ اپنی رائے اور خیالات کو ٹھونسنے کی کوشش مت کیجیے۔ نہ اس کا تاثر دیجیے۔

۲۔ کسی کی غلطی کو پکڑنے کی ' لقمہ دینے کی اور بار بار حوالہ دینے کی کوشش مت کیجیے۔

۳- کم گو شرکا کو بولنے کا موقع دیجیے اور انھیں اس انداز سے گھیر کر آگے بڑھائیے کہ وہ ضرور شریک گفتگو ہوں۔

۴- اچھے اور بامقصد اور لطیف انداز میں گفتگو کو آگے بڑھاتے رہیں۔

۵- خیالات اور تجاویز کو دہرانے سے بچائیے۔

۶- کسی نقطہ نظر پر اجتماعی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔ ضد اور ہٹ دھرمی سے بچیے ۔ ناک اور انا کا مسئلہ مت بنائیے۔ اپنے اختیارات کو کم از کم استعمال کرنے کی کوشش کیجیے تاکہ ہم آہنگی برقرار رہے۔

۷- ذاتی حملوں سے محفوظ رہیے اور محفوظ رکھیے۔

۸- گروپ اور ٹیم کو ایکشن اور عمل کی جانب لے جائیے۔

۹- میٹنگ کو موثر بنانے کے لیے رائے اور مشورے طلب کیجیے۔

۱۰- اپنے آپ کو احتساب کے لیے پیش کیجیے

۱۱- افراد سے ذاتی دلچسپی رکھیے۔ ان کے مسائل اور گھریلو معاملات سے دلچسپی لیجیے۔ انھیں ان کی ذات میں شرکت کا احساس ہونا چاہیے۔

کامیاب ٹیموں کے تجربات سے اسباق

ترقی یافتہ ممالک اور خاص کر جاپان میں ٹیم ورک کا رواج بہت زیادہ ہے' اور وہاں کے تجربات تحریری شکل میں موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے تجربات ضرور ہوئے ہوں گے۔ مگر ریکارڈ پر معلومات بہت کم ہیں۔

ٹیم اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے ضروری عوامل

۱- اتحاد کا احساس : ٹیم سپرٹ کے لیے اس احساس کی ضرورت ہے۔ یہاں "ہم" کا احساس ضروری ہے۔ یہاں ایک دوسرے کی کمزوریوں کو رفع کرنے اور ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے سیکھنے کے ماحول کی ضرورت ہے۔ ٹیم کے تشخص اور علامات (Symbols) کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے سے متعارف ہونے اور مسائل کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کھلے اور آزاد ماحول میں گفتگو اور خیالات کے اظہار کا صرف احساس اور تاثر نہ ہو' بلکہ یہ ایک حقیقت ہو۔

۲- احساس ذمہ داری : یہ احساس کامیاب لوگوں کی خصوصیات میں شامل ہے۔ اپنے کام کی فکر اور اس کے احساس کے باعث لوگ راتوں کو اپنے ادارے کے لوگوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں

اور احساس دلاتے ہیں کہ وہ بھی ان کے ساتھ جاگ رہے ہیں۔
یہ احساس قیادت کے تاثر 'معلومات کی فراہمی 'مستقبل کے شاندار ہونے کے احساس اور عمومی جائزے کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ اعتماد اور حسن ظن : اعتماد کی فضا 'ایک دوسرے کے بارے میں اچھی رائے اور بھروسہ ایسی خصوصیات ہیں جس کے ذریعے ٹیم مربوط رہتی ہے اور ترقی کرتی ہے۔ بعض اداروں میں ٹیم اسپرٹ کی وہ فضا پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو حاضری کے رجسٹر پر آمدورفت کے اوقات لکھنے اور ٹائم کارڈ پنچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۴۔ احساس ملکیت : افراد میں اس بات کا احساس پیدا ہو جائے کہ وہ جو کام کر رہے ہیں یہ ان کا اپنا کام ہے تو پھر غلطیاں کم ہوتی ہیں اور ذمہ داری کا احساس بڑھتا رہتا ہے۔ اگر لوگوں کو یہ احساس ہو کہ ان کا کام آگے والا بھی چیک کرے گا تو پھر وہ ذمہ داری کو ٹالنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ انھی کا کام ہے ' وہی ذمہ دار ہیں ' تو پھر غلطیوں اور کوتاہیوں کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ کام نہ کرنے اور غیر حاضری کا رجحان کم ہوتا جائے گا۔ اسی احساس کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ٹیم کے افراد کو کام کے نتائج اور کاروبار کے نفع و نقصان کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ ٹیم کے افراد کو اپنی کارکردگی دیکھنے کا موقع دیا جائے۔ ٹیم کے افراد کو خطرے سے بچانے کی خاطر مدد کے لیے آگے مت بڑھیے بلکہ انھیں حالات سے خود نمٹنے دیجیے۔ ممکن ہے کسی تخلیقی عمل کے ذریعے سیکھنے کا موقع ملے۔ ٹیم کو اپنا اندرونی ریکارڈ رکھنے کا موقع دیجیے مگر غیر ضروری معلومات طلب مت کیجیے۔ ٹیم کو وہ حدود بتا دی جائیں جہاں وہ خود مختار ہیں۔

۵۔ پہل، پیش قدمی : ٹیم کے افراد میں ہر قسم کے بحران سے نمٹنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس سلسلے میں وہ اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتے۔

۶۔ رابطہ و افہام و تفہیم : ٹیم کے افراد آپس میں بھی معلومات کا تبادلہ کریں۔ حقائق کو جاننے کی کوشش کریں۔ زیریں افراد سے بھی معلومات ملیں اور اعلیٰ منصب کی جانب سے بھی اطلاعات ملیں اور پھر وہ ٹیم اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے۔

۷۔ قدر افزائی : قدر افزائی کے چند الفاظ اور ان کی خدمات کے صلے میں علامتی انعام اپنی جگہ اہمیت اور قدر رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کیا جا سکتا ہے : ادارے کی جانب سے ٹیم کے افراد اور ان

کے اہل خانہ کو ادارے کے اخراجات پر تحائف دینا' کھانے کی دعوت کرنا' ہر ہفتے کی ٹیم یا ہر ماہ کی ٹیم کا باقاعدہ اعلان کرنا' ٹیم کے نام سے ادارے کے نفع میں سے خیرات کرنا یا کسی اسکول' لائبریری یا ادارے میں اس ٹیم کے نام کی اسٹامپ کے ساتھ کتب دینا۔

۸۔ موافقت ، ہم آہنگی : اگر مقصد کے بارے میں ذہن صاف ہوں تو یہ موافقت کی بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں تجاویز پر ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہے اور میٹنگ میں مشترک مقصد تک پہنچنے ہی کے لیے گفتگو ضروری ہے۔

۹۔ تکمیل : ٹیم کے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔ ادھورے کاموں سے مایوسی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں باقاعدگی سے جائزہ لیتے رہیں اور ٹیم کو بتاتے رہیں کہ وہ مجموعی مقاصد سے کس قدر قریب ہوگئے ہیں' اور اس میں وہ خود کس حد تک شامل رہے ہیں۔

کامیاب اور موثر ٹیم لیڈر کی خصوصیات

۱۔ پہلی خوبی "ہم" اور "ہمارا" کا تصور ہے۔ وہاں مینجمنٹ اور مزدور الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں۔ ہمیشہ "ہم" کے ساتھ بات کی جاتی ہے اور "ہمارے" لیے ہی کام ہوتا ہے۔

۲۔ ممبران کی مدد کیجیے' راہ نمائی کیجیے مگر خطرے کی صورت میں انھیں پکڑنے کی کوشش مت کیجیے' انھیں سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع دیجیے۔ اس سے ان میں اعتماد پیدا ہو گا۔

۳۔ ٹیم کے ممبران پر توجہ دیجیے۔ ان کے خاندان اور متعلقین کے متعلق معلومات رکھیے۔ ان کے مشاغل کا علم رکھیے۔ ان کے کام' ذات اور کیریر کے مسائل معلوم کرتے رہیے۔ ان ممبروں سے ضرور رابطہ رکھیے جو میٹنگ میں خاموش رہتے ہیں۔ شکریہ کے الفاظ ضرور ادا کیجیے

۴۔ امتیازی تشخص کی علامات کو ختم کیجیے۔ افسران کے لیے کھانے کے الگ کمرے' الگ پارکنگ' یہ تشخص کی علامات ہیں مگر جہاں ٹیم ورک کی ضرورت ہو وہاں یہ چیزیں منفی اثرات پیدا کرتی ہیں۔ ایک انتہائی کامیاب ادارے کے سربراہ کی خصوصیت یہ رہی کہ وہ کھانا اپنے مزدوروں کے ساتھ کھاتے تھے۔ حالانکہ یہ کمپنی پاکستان کی ان چند کمپنیوں میں سے ہے جہاں پہلے ہی سال میں شاندار نفع سے آغاز ہوا۔

۵۔ اس بات کو یقینی بنایئے کہ ٹیم کی میٹنگ خوشگوار ماحول میں ہو۔

۶۔ ٹیم لیڈر کو اپنی تربیت اور ترقی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

۷۔ موثر اور کامیاب لیڈر اپنے مشن سے دلچسپی رکھتا ہے۔

۸۔ وہ جہد مسلسل کا قائل ہوتا ہے اور کرشموں کا انتظار نہیں کرتا۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ محنت ہی اس کی جاگیر ہے اور اسے اللہ پر بھروسا ہوتا ہے کہ اس کی محنت ضرور پھل لائے گی۔

۹۔ اسے اپنی غلطیوں کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہوتا، اس سے اس کی عزت نہیں گھٹتی۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے ۔۔۔ قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

۱۰۔ کامیاب ٹیم لیڈر ایک اچھا استاد بھی ہوتا ہے۔ لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیتا ہے۔ اپنے سے زیادہ باصلاحیت افراد کو اپنے سے آگے بڑھنے کا نہ صرف موقع دیتا ہے بلکہ راہنمائی بھی کرتا ہے۔

۱۱۔ ٹیم کا اعتماد حاصل کرتا ہے۔

ان تمام خصوصیات کے ساتھ اسے ٹیم کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔

درپئے دنیا، دین ہم رفت

ظالمانہ سیاست کا دردناک انجام

مناظر احسن گیلانی

طائف کے بھٹی خانوں میں ایک بازاری عورت تھی۔ سمیہ اس کا نام تھا۔ طائف کے طبیب حارث بن کلدہ کی وہ باندی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایران کے کسی دہقان (قان ؟ د) یعنی زمین دار نے شفایابی کی خوشی میں بطور فیس کے یہی لونڈی عرب کے اس معالج حارث کو بخش دی تھی۔ حارث سمیہ کو طائف لے آیا۔ کچھ دن بعد اپنے ایک رومی غلام عبید کے ساتھ سمیہ کا عقد بھی کر دیا تھا۔ لیکن عبید کی منکوحہ ہونے کے بعد بھی سمیہ بغی (خرچی کمانے والی عورت) کا کام کرتی تھی۔ پستی کا آخری درجہ کسی عورت کے متعلق جو تصور کیا جا سکتا ہے، اسی حال میں یہ بے چاری جاہلیت کے زمانے میں گرفتار تھی۔

اچانک عرب میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ زندگی کا نیا دور شروع ہوا، بچھڑی اور گری ہوئی انسانیت اٹھنے لگی، اور کیسا اٹھان! اس کسمپرس عورت کے گودڑوں میں لپٹا ہوا لڑکا بھی اونچا ہوا۔ اونچے ہونے کے مواقع اس کے سامنے پیش ہوئے، پیش ہوتے ہی چلے گئے۔ اس نے پڑھا، لکھا۔ سترہ اور اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایسی تقریریں کرنے لگا کہ الخطیب المصقع (ایسا مقرر جو بھی نہ تھکتا ہو) کی سند فاروقی دربار سے حاصل ہوئی۔ (ابن عساکر، ج ۵، ص ۴۰۶)

ایران کی جنگی مہموں میں اموالِ غنیمت اور فتوحات کے متعلق حساب کتاب کا کام بھی وہی کرتا تھا، اور فوج میں بخشی (فنانس) کی خدمت اسی کے سپرد تھی۔ اس کے تقریری اور انشائی کمالات کا شہرہ بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچا کہ یکے بعد دیگرے مختلف گورنروں کے سیکرٹری (کاتب) ہونے کی عزت اس کو حاصل ہوئی۔ لکھا ہے کہ وہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عامر، مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے سیکرٹری کا کام انجام دیتا رہا (ابن عساکر، ج ۵، ص ۴۰۷)۔ اور خلافت مرتضوی کے

دور میں تو ایران کا گورنر ہی بن گیا۔

یہ اسی سمیہ کنیز کا لڑکا' زیاد تھا۔ اس نے امیر معاویہ ؓ کے زمانے میں یہاں تک عروج حاصل کیا کہ "حضرت معاویہ ؓ نے زیاد کو بصرہ و خراسان اور سجستان کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے بعد ہند یعنی سندھ اور بحرین و عمان کی حکومت بھی اسی زیاد کے حوالے کر دی گئی" (طبری وغیرہ' ج ۵' ص ۱۳۴)

مورخین اسلام نے ایرانیوں کی طرف اس قول کو اپنی کتابوں میں منسوب کیا ہے' یعنی "ایران والے کہا کرتے تھے کہ یہ عربی' یعنی زیاد' کسریٰ نوشیرواں کے ساتھ اپنے چال چلن' رنگ ڈھنگ میں جتنا مشابہ ہے' ہم نے ایسا آدمی نہیں دیکھا" (طبری' ج ۵' ص ۸۰)۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ جاہلیت کے زمانے کی ایک لونڈی کے بچے تک کو کج کلاہ ایران بن جانے کا موقع اسلامی دور میں مل گیا۔ اسلام کا ظہور نہ ہوتا تو کون جانتا ہے کہ ایک باندی اور غلام' جو بے چارے عربی النسل بھی نہ تھے' ان کے اس بچے کا انجام کیا ہوتا؟ مگر عرب کے جاہل چیخ رہے تھے' چلا رہے تھے۔ بظاہر اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی' فتح مکہ کے موقع پر جب کعبہ کی چھت پر بلال حبشی ؓ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اذان دینے کا حکم ہوا' تو قریش کے بعض بوڑھے سرداروں کو دیکھا گیا تھا' کہتے تھے: اچھا ہوا ان رسوائیوں کو دیکھنے کے لیے والد مرحوم زندہ نہ رہے"۔ حضرت بلال ؓ کی آواز سن کر بے ساختہ ایک قریشی سردار کی زبان سے یہ فقرہ نکلا: "محمد ؐ کو اس کالے کوے کے سوا اذان دینے کے لیے اور کوئی نہ ملا"۔ کوئی بڑبڑا رہا تھا: "خدا کی قسم یہ بہت بڑا حادثہ ہے کہ بنی جمح والوں کا غلام (بلال) کعبہ کی چھت پر کھڑا گدھے کی طرح چیخ رہا ہے" (سیرۃ محمدیہ' فتح مکہ)۔

مگر ان باتوں کا عادی بنانے کے لیے اسلام ظاہر ہوا تھا۔ قریشی خاتون' ام المومنین زینب بنت جحش ؓ کا پہلا عقد' اپنے مولیٰ یعنی آزاد کردہ غلام حضرت زید ؓ سے رسول اللہ ؐ نے جس وقت کیا تھا' کوئی شبہ نہیں کہ ہزارہا برس کے رسم و رواج کے مقابلے میں یہ بے محابا ایسی ضرب لگائی گئی تھی جس سے مکہ ہی کیا' سارا عرب ہی تلملا اٹھا' زمین کے ساتھ آسمان بھی ہل گیا تھا۔ خود ام المومنین سیدہ زینب ؓ بھی زید ؓ سے اس رشتے کو نباہ نہ سکیں اور اسی کی تلافی بھی غالباً ایک مصلحت اس نکاح کی تھی جو خود رسول اللہ ؐ نے حضرت زینب ؓ سے کر لیا۔ لیکن وہی قریش جو پہلی دفعہ اس واقعہ کو برداشت نہ کر سکے' دیکھا گیا کہ بعد کو یکے بعد دیگرے اپنی لڑکیوں کا عقد حضرت زید ؓ ہی سے بخوشی و رضا کر رہے تھے۔ (ابولہب کی صاحبزادی درہ ؓ' عتبی کی لڑکی ام کلثوم ؓ' زبیر بن العوام ؓ کی ہمشیرہ ہند ؓ سے حضرت زید ؓ نے عقد کیا' یہ سب کی سب قریش کے اعلیٰ خاندان کی خواتین تھیں) اور ابن شیبہ کی اگر یہ

روایت صحیح ہے ...... یعنی حضرت عائشہ ؓ کی طرف یہ قول جو منسوب کیا گیا ہے کہ "اگر زید ؓ زندہ رہ جاتے تو اپنے بعد رسول اللہ ؐ زید ؓ کو اپنا خلیفہ بناتے" (اصابہ: ج ۳، ص ۲۶) - اور رسول اللہ ؐ کی زندگی ہی میں حضرت زید ؓ کی شہادت کا سانحہ نہ پیش آ جاتا' تو یقیناً اسلام میں غلامی اور غلاموں کی تاریخ اس سے بھی زیادہ شاندار بہت شاندار ہوتی جتنی کہ اب ہے - آخر اس سے زیادہ اور کیا چاہا جا سکتا ہے کہ زیاد جیسے آدمی کو ایران کے کسریٰ و نوشیرواں بن جانے تک کا موقع اسلام میں مل گیا - ان ہی عربوں نے یہ عہدہ اس کے سپرد کیا جو چند دن پیش تر غلاموں کی مؤاخی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے - وطنی اور نسلی عصبیت کے نشے میں جو چور تھے' ان میں یہ کیسا انقلاب تھا کہ جس شخص کی رگوں میں ۔ ماں ہی کی طرف سے عربوں کا خون پہنچا تھا' اور باپ بھی جس کا سمجھا جاتا تھا کہ عربی نہیں بلکہ رومی غلام عبید نامی ہے' وہی قریشی النسل سرداروں اور عرب کے عام قبائل کا امیر بن جاتا ہے -

مگر یہ عجیب بات ہے' اور حافظ کی کمزوری کا یہ کتنا دلچسپ مظاہرہ تھا' کہ جوں جوں اسلام کی بدولت بلندی کے زینوں کو سمیہ باندی کا یہ لڑکا طے کرتا جاتا تھا' اسی نسبت سے وہ اپنی پستیوں کے پچھلے حالات کو بھولتا یا بھلاتا جاتا تھا - دیکھنے والوں نے اسی زیاد کو اس حال میں دیکھا تھا کہ خچر پر سوار ہے' لگام میں بجائے چمڑے کے رسی بندھی ہوئی ہے' بدن پر اس کے پیوند دوز کرتا ہے (طبری' ج ۵' ص ۱۶۳) - لیکن ایک زمانہ آیا کہ وہی زیاد لوگوں کے سامنے دیبا یا حریر کی قبا میں' خز یا پاپلین کی چادر اوڑھے ہوئے' اس حال میں برآمد ہوتا تھا کہ آگے تیغ برہنہ نقیب اکڑتے ہوئے' لوگوں کو راستوں سے ہٹاتے ہوئے چلتے تھے (طبری' ج ۵' ص ۱۶۳) -

اس زمانے میں اس کی حسی نزاکت کی کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ سمیہ' اس کی ماں کی طرف منسوب کر کے نام لینے والوں پر بپھر جاتا - انتہا یہ ہے کہ سیدنا امام حسن ؓ نے اپنے سفارشی خط میں زیاد بن سمیہ کے نام سے اس کو جب مخاطب فرمایا' تو غصہ میں جواب دیتے ہوئے' بجائے حسن ؓ بن علی ؓ کے حسن ؓ بن فاطمہ ؓ کے نام سے حضرت والا کو اس نے موسوم کیا - اس خط میں اس نے اور بھی ایسی ناقابل بیان گستاخیوں سے کام لیا تھا کہ حضرت امیر معاویہ ؓ کو اس کی اطلاع امام حسن ؓ کے ذریعے جب ملی' تو لکھا ہے کہ "شام کی سرزمین امیر معاویہ ؓ پر تنگ ہوگئی" - اسی وقت غیظ و غضب سے بھرے ہوئے فرمان سے زیاد کو آپ نے ڈانٹ بتائی' اور لکھا کہ فاطمہ ؓ کی طرف انتساب سے حسن ؓ کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے یا کمی' اس کا بھی اندازہ غصے میں تجھے نہ ہوا -

بیچاری سمیہ' جس کے پیٹ سے پیدا ہونے کے انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی' اس بے چاری کو تو وہ بھول بیٹھا تھا اور بھولتا کیا معنی' اس کی طرف انتساب زیاد کے لیے ناقابل برداشت بن چکا تھا - مگر

جب بعض لوگوں نے 'امیر معاویہ ؓ کی حکومت کے زمانے میں ' یہ گواہی دی کہ طائف کے بھٹی خانے میں امیر معاویہ ؓ کے والد ابو سفیان ؓ نے ایام جاہلیت میں زیاد کی ماں سمیہ باندی کے ساتھ 'بقول ابن خلدون "جاہلیت کے نکاحوں میں سے نکاح کے کسی خاص طریقے کو اختیار کر کے تمتع حاصل کیا تھا" (ج ۳ 'ص ۷) 'تو اس بنیاد پر وہی زیاد 'جو زیاد بن عبید اب تک مشہور تھا 'اچانک اس باپ کو بھی بھلا بیٹھا 'اور اپنے نام کے ساتھ زیاد بن ابی سفیان لکھنے لگا۔

دولت رسی کی مستی میں جو اپنی ماں اور باپ تک کو فراموش کر چکا ہو کیوں تعجب کیجیے اگر سیدنا علی ؓ کے سارے احسانات کو بھلا کر کوفہ اور بصرہ کی گورنری کے زمانے میں زیاد وہ حرکت کر گزرا ہو 'جس کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔

اس واقعہ کا حاصل یہ ہے کہ بصرہ 'کوفہ یعنی عراق اور ایران 'خراسان 'سجستان 'سندھ 'بحرین و عمان کی حکومت پر قابض ہونے کے بعد بھی زیاد کا جی نہ بھرا۔ حضرت امیر معاویہ ؓ کی خدمت میں اس نے یہ درخواست روانہ کی کہ "اب خلافت کی طرف سے جو علاقے میرے سپرد کیے گئے ہیں 'ان علاقوں پر تو اپنے بائیں ہاتھ میں سے قابض اور مسلط ہوں 'لیکن میرا داہنا ہاتھ اس وقت تک یوں ہی خالی پڑا ہوا ہے۔ اگر حجاز اور حجاز کے ساتھ یمامہ ' نجد وغیرہ کے علاقے بھی مجھے سونپ دیے جائیں تو میرے داہنے ہاتھ کے لیے ایک کام نکل آئے گا"۔

ادھر تو بارگاہ خلافت میں زیاد نے یہ عرض داشت روانہ کی 'ادھر اپنے خیال میں تیر کو نشانے پر بٹھانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ کوفہ میں اجتماع عام کا اعلان کیا گیا۔ زیاد کے خوف سے لوگ اتنے جمع ہوئے کہ "مسجد اور میدان دار الامارہ کا صحن 'سارے مقامات معمور ہو گئے"۔ غرض زیاد کی یہ تھی کہ وہی حضرت علی ؓ جنھوں نے ایران کا والی بنانے کا شرف اس زیاد کو عطا فرمایا تھا 'ان کو 'اور ان کی ساری نوازشوں کو 'ان کے فضائل و کمالات کو 'نبوت کبریٰ ؐ سے گوناگوں تعلقات جو حضرت والا کے تھے ' سب ہی کو ' اپنے حافظہ سے نکال کر "حضرت علی ؓ سے تبرا اور علیحدگی کے مسئلے کو کوفہ کے باشندوں پر پیش کرے"۔ (ابن عساکر 'ج ۵ 'ص ۴۲۱)

مطلب یہی تھا کہ قلوب میں سیدنا علی ؓ کے ساتھ جو لگاؤ کوفہ والوں کا باقی تھا 'اس رشتے کو بھی ختم کرائے۔ خیال یہی ہو گا کہ اس کی خبر جب دمشق میں امیر معاویہ ؓ کے پاس پہنچے گی 'تو حجاز اور عرب کے دوسرے علاقوں کی حکومت کی درخواست بہ آسانی منظور ہو جائے گی۔

حالانکہ یہی زیاد تھا 'ایران کی گورنری کے زمانے میں بھی امیر معاویہ ؓ کی طرف سے یہ سلسلہ جنبانی کی گئی تھی کہ وہ حضرت علی ؓ کی رفاقت ترک کر کے ان کا ہم نوا بن جائے۔ لیکن اس وقت تک

حضرت علیؓ زندہ اور برسراقتدار تھے۔ جواب میں زیاد نے کہا تھا: میں اور حضرت علیؓ کی رفاقت چھوڑ دوں؟" میرے اور معاویہؓ کے درمیان رسول اللہ ؐ کے چچا (ابوطالب) کے بیٹے حضرت علیؓ ہیں" (ایضاً' ص ۱۱۴)۔

مگر اب اس کا حافظہ ان ساری باتوں سے خالی ہو چکا تھا' ایسا کیوں ہوا؟

ایران والے اسے سیاست وتدبر میں نوشیرواں کا نمونہ اور نظیر قرار دیتے تھے۔ اپنے اقبال و عروج کے دنوں میں عرب جب اپنے بڑے سیاسی مدبروں کا ذکر کرتے تو امیر معاویہؓ' عمرو بن عاصؓ' مغیرہ بن شعبہؓ کے ساتھ ساتھ زیاد کا نام بھی لیتے تھے۔ ہمارے مورخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ سیدنا حضرت علیؓ کے اچانک شہید ہو جانے کی وجہ سے آپؓ کے مقبوضہ علاقوں میں عموماً اور کوفہ وبصرہ کی چھاؤنیوں میں خصوصاً افراتفری کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ زیاد نے راستہ جو بھی اختیار کیا ہو' لیکن اس گڑبڑ اور شور و شر کے مٹانے میں جو کامیابی اس کو حاصل ہوئی' اور دیکھنے والوں نے زیاد کی حکومت کے زمانے میں جو کچھ دیکھا تھا' شاید اس زمانے کی بڑی سے بڑی دستوری اور آئینی حکومتوں میں بھی ان تماشوں کے لیے لوگ ترستے ہی رہیں گے۔ طبری میں ہے کہ زیاد نے بطش شدید والی داروگیر سے یہ رنگ قائم کر دیا کہ "ہر شخص دوسرے سے اپنے آپ کو محفوظ پانے لگا"۔

اور کیسا 'امن' کیسی حفاظت! طبری ہی کے الفاظ ہیں "کسی مرد یا عورت کی کوئی چیز راستے میں گر پڑتی' اس کے اٹھانے کی بھی جرات کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ چیز پڑی رہتی تا آنکہ جس کی چیز ہوتی وہی اس کو اٹھاتا"۔ یہ بھی تاریخ کی شہادت ہے کہ "عورتیں گھروں کے دروازوں کو بند کیے بغیر راتیں گزارنے لگیں" (طبری' ج ۵' ص ۱۲۶)

یہ' اور اس کے سوا' زیاد کی حکومت کی خصوصیتوں کو مورخین نے بڑے شان دار الفاظ میں بیان کیا ہے۔ دنیا کے موجودہ لادینی عہد میں زیاد بھی اسی لیے شاید ان لوگوں میں شمار ہو سکتا ہے جنھیں چاہا جائے تو حکمرانی اور جہاں بانی میں نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔ مگر لادینی ذہنیت رکھنے والوں کی نگاہوں میں زیاد کی جتنی قدر و قیمت ہو' میرے نزدیک تو صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے جس غلط راستے کو اس نے اختیار کیا تھا' یہ راستہ ہی ایسا ہے جس میں آدمی بھولنا نہ بھی چاہے' جب بھی ایسی ساری چیزیں اس سے بھلا دی جاتی ہیں' جن کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حافظہ سے کیسے نکل سکتی ہیں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی باگ' خصوصاً جب کوفہ وبصرہ کی گورنری کا جائزہ زیاد نے لیا' تو سب سے پہلے جو چیز اس کے دماغ سے نکل گئی' وہ اپنے خالق اور مالک کی یاد تھی۔

منبر پر چڑھ کر وہ کڑکتا تھا: "خواہ کچھ ہی ہو' لیکن مجرموں کے بدلے میں غیر مجرموں کو میں پکڑوں

گا"۔

ایک مومن عرب نے کہا بھی: "زیاد! خدا کا قانون تو یہ ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرے پر نہ ڈالا جائے، یعنی لَاتَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا (فاطر ۳۵: ۱۸) لیکن تو تو خدا سے بھی بڑھ گیا۔ دھمکاتا ہے کہ جس نے جرم نہیں کیا اس کو جرم کرنے والے کی جگہ پکڑے گا"۔

جواب میں زیاد نے کہا تھا: "تم جو راہ مجھے بتارہے ہو، اب یہ راہ تمھارے سامنے نہ آئے گی، جب تک کہ خون کے دریا تم میں نہ بہادیے جائیں" (طبری، ج ۵، ص ۱۲۵)

جب تک زیاد زندہ رہا، وہی کرتا رہا جو وہ کہتا تھا۔ معمولی شک و شبہ پر گردنوں کا اڑا دینا، گھروں کو گرا دینا، لوگوں کو پٹوانا، جیل میں ڈال دینا، ان باتوں کی اس کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ کہنے والوں نے تو اسی لیے یہاں تک کہہ دیا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے سفاک، ظالم "حجاج کے مقتولوں کی تعداد ضرور زیادہ ہے، لیکن مسلمانوں کے بے تحاشا قتل کرنے کی جسارت میں زیاد، حجاج سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا تھا" (ابن عساکر)

(۲)

خلاصہ یہ ہے کہ سب کچھ یاد رکھتے ہوئے، زیاد نے خدا ہی کو بھلا دینا چاہا، اور اس کو بھلا دیا تھا۔ ایسی صورت میں کیوں تعجب کیجیے، اگر اس کے حافظے سے اپنی ماں سمیہ، اپنے باپ عبید، اور اپنے سب سے بڑے محسن و ولی نعمت سیدنا علیؓ کی یاد نکل گئی، آخر نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ انھوں نے بھلا دیا اللہ کو، بس اللہ نے بھی فراموش کرا دیا، ان کو خود اپنے آپ سے (الحشر ۵۹: ۱۹)۔ یہ تو قرآن ہی کا قدرتی قانون ہے۔ خدا کو بھول جانے کے بعد زیاد درحقیقت خود اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس لیے نہ ماں ہی اس کو اپنی یاد رہی اور نہ باپ، اور نہ بزرگوں کو وہ یاد رکھ سکا جن کی تربیت و تعلیم نے باندی کے اس بچے کو ایران و خراسان کی گورنری کے لائق بنا دیا تھا۔

اپنے آپ کو فراموش کیے ہوئے اس انسان میں برسرحکومت آنے کے بعد شاید یہ وہم پیدا ہوا کہ "گورنر" ہونے کے سوا نہ پہلے وہ "اور کچھ" تھا۔ اور نہ آیندہ اسے "اور کچھ" ہونا ہے۔ گورنری کو اسی لیے شاید وہ اپنا پیدائشی حق یقین کرنے لگا۔ اسی لیے زمین کا وہ طویل و عریض رقبہ جو کمشنری ایران کے مقبوضہ سے بھی بڑا اور کافی بڑا تھا، ان خطوں کی حکومت بھی اس کو ناکافی نظر آنے لگی۔ آگے قدم بڑھانے کے لیے حجاز اور عرب کی عام حکومت کی درخواست اس نے پیش کر دی۔ اور مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے "اجتماع عام" کا حکم کوفہ والوں کو اس لیے دیا کہ حضرت علیؓ سے

تبرا کا اقرار ان سے لے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب سب کچھ وہ اپنے آپ ہی کو تصور کر رہا تھا' اور جس نے پیدا کر کے اس قابل اس کو بنایا تھا' اس کی ذمہ داریوں سے اپنی آنکھیں بیچے ہوئے تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ بندر لاکھ اپنی آنکھیں بند کر لے 'پھن کھولے ہوئے سانپ کا وجود تو اس کی آنکھیں بند کرنے سے معدوم نہیں ہو سکتا۔ جس خدا سے زیاد نے اپنے آپ کو غافل بنا لیا تھا' وہ اچانک اس کے سامنے آگیا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ حجاز کے شہروں 'مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں یہ خبر پہنچی کہ زیاد نے وہاں کی حکومت کی خواہش امیر معاویہ ؓ سے کی ہے' تو لوگوں میں کافی بے چینی اور سراسیمگی پھیل گئی۔ عمر فاروق ؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے چند لوگوں کو جمع کیا۔ خود دعا کرتے جاتے تھے کہ اے پروردگار' زیاد کی مصیبت میں ہم لوگوں کو مت مبتلا فرما' اور دوسرے آمین کہتے تھے۔
(کامل ابن اثیر' ج ۴' ص ۱۱۱)

مدینہ منورہ میں تو یہ ہو رہا تھا۔ ادھر کوفہ میں' جہاں اجتماع عام کا حکم زیاد نے دیا تھا' کوفہ کا ہر قابل ذکر آدمی زیاد کی ڈیوڑھی کے سامنے انتہائی حیرانی اور پریشانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ دارالامارہ سے لوگوں کو خطاب کرنے کے لیے زیاد ابھی باہر نہیں نکلا تھا' ایک صاحب' جن کا نام عبدالرحمٰن بن سائب تھا اور اسی مجمع میں وہ بھی شریک تھے' کہتے ہیں کہ اچانک مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ بیٹھے بیٹھے غنودگی کے اسی حال میں کیا دیکھتا ہوں کہ:

بڑی لمبی چوڑی گردن اونٹ کی گردن کے مانند میرے سامنے نمایاں ہوئی' جس کے ہونٹ لٹکے ہوں اور پوٹے بھی جس کے پھولے پھولے ہوں۔

عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے' جواب میں' میں نے سنا' وہ لمبی گردن بول رہی ہے:

میں چن لینے والے کا باپ 'گردن والا ہوں۔ اسی قصر (دار الامارہ) والے کے لیے اٹھایا گیا ہوں۔

اسی کے بعد غنودگی کی کیفیت کا ازالہ ہو گیا۔ ارد گرد ان کے جو لوگ تھے ان سے عبدالرحمٰن پوچھنے لگے' آپ لوگوں نے بھی کچھ دیکھا۔ بولے 'نہیں ہمیں تو کچھ نظر نہ آیا۔ تب میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کا حال ان لوگوں سے بیان کرنے لگا۔ بیان کر ہی رہا تھا کہ اچانک قصر سے ایک شخص برآمد ہوا اور اعلان کیا:

امیر (یعنی زیاد) کا حکم ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں' کیوں کہ میرے ساتھ ایک قصہ پیش آگیا

ہے -

آلام و مصائب کا سیاہ بادل تھا جو چھانے کے بعد اچانک اس اعلان کے ساتھ ہی پھٹ گیا' لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے - ابھی مجمع رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ گورنر ہاؤس سے یہ خبر مجمع تک پہنچی کہ زیاد پر طاعون یا فالج کا حملہ ہو گیا ہے -

زیاد اب صاحب فراش تھا - تکلیف سخت اور بہت سخت تھی - کہتے ہیں کہ جس مقام پر طاعون کی گلٹی یا پھوڑا نمایاں ہوا تھا' زیاد بار بار چاہتا تھا کہ بدن کے اس حصے کو کٹوا دے - آپریشن کرنے والے اس حکم کے مطابق چیر پھاڑ کے آلات اور کاٹنے کے بعد داغنے کا سامان لے کر آ بھی گئے - لیکن ان لوگوں کی خاص شکل و صورت اور ان کے مہیب آلات کو دیکھ کر زیاد پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ان کو اس نے واپس کر دیا - پلنگ پر تلملا تلملا کر کروٹیں بدلتا تھا اور کہتا "میں اور طاعون کا یہ پھوڑا' دونوں ایک لحاف کے اندر رات بھر کیسے بسر کر سکیں گے"۔

کراہ کراہ کر ساری رات گزاری - صبح جس وقت ہوئی' تو حالات اتنے ابتر ہو چکے تھے کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق کے نیچے اتار نا فرباد کے جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ دشوار ہو چکا تھا - پانی منہ میں ڈالتا تھا' لیکن اسے نگل نہیں سکتا تھا' کوفہ کے گورنر ہاؤس میں ہنگامہ مچا ہوا تھا - لوگ آ رہے تھے' جا رہے تھے -

احبا اپنی تدبیروں میں مشغول تھے کہ اچانک ایک شور برپا ہوا' معلوم ہوا کہ دمشق سے شاہی فرمان لے کر لوگ آئے ہیں - ہیثم نامی شخص' برید کا سرگروہ تھا - زیاد نے حجاز' نجد' یمامہ' عرب کے علاقوں کی گورنری کی جس آرزو کو حکومت میں پیش کیا تھا' اس کی منظوری کا فرمان دربار خلافت سے صادر ہوا تھا - زیاد درد و کرب کی شدت سے تڑپ رہا تھا کہ سرہانے پہنچ کر یہ مژدہ اس کے کانوں تک پہنچانے والے نے پہنچایا کہ "گورنر ہاؤس" کے دروازے پر ہیثم کھڑا ہے' اس کے ساتھ وہ فرمان شاہی ہے جس میں حجاز پر تمھاری گورنری کی منظوری صادر ہوئی ہے"۔

خدا ہی جانتا ہے کہ زیاد اپنے دل میں حجاز کی حکومت کی تمنا کو کب سے پال رہا تھا - وہی حجاز جس میں دوسرے مقامات کے ساتھ طائف کا وہ شہر بھی تھا جہاں سمیہ باندی کے پیٹ سے وہ رومی غلام عبید کے گھر پیدا ہوا تھا - لیکن زندگی کی یہی سب سے بڑی آرزو جب واقعہ بن کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تو سنا گیا کہ زیاد کہہ رہا تھا :

"دور ہو جاؤ ہیثم! اور اپنے ساتھ جو کچھ لایا ہے اب وہ میرے کس کام کا! خدا کی قسم پانی کا ایک گھونٹ جو حلق سے نیچے اتر جائے' میرے لیے ہیثم اور ہیثم اپنے ساتھ جو کچھ لایا ہے' اس سے کہیں

زیادہ محبوب ہے" (ابن عساکر 'ج ۵' ص ۴۲۲)۔

اور اب اپنی بھلائی ہوئی حقیقت کی یاد نکلنے کے بعد اس کے حافظہ میں واپس آئی۔ اس کے سامنے اب نہ ایران تھا نہ خراسان 'نہ عراق' نہ سندھ 'نہ بحرین اور نہ عمان۔ جو کچھ بھی تھا اس کا اندازہ اس وصیت نامے سے ہوتا ہے ' جسے ابن عساکر ہی نے حضرت امام شافعی کے حوالے سے اپنی کتاب تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے۔ وصیت نامے کا ترجمہ یہ ہے :

اللہ کا حکم جو سامنے آچکا ہے اسی کا انتظار کرتے ہوئے 'یہ وصیت نامہ لکھوا رہا ہوں۔ حق سبحانہ و تعالیٰ کی قدرت میرے لیے ناقابل انکار بن چکی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے 'وہی تنہا ہے 'اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔ یہ گواہی اس شخص کی ہے جو اپنے مال کو جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اپنے حساب و کتاب کا ڈر جس پر مسلط ہے۔ میں اس کی بھی شہادت ادا کرتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول 'پیغام پہنچانے والے ہیں۔ میں مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ کو بھی 'اور عام مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرتے رہیں۔ "اور نہ مرے ان میں کوئی مگر اپنے آپ کو مسلمان بنائے ہوئے"۔ چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک بڑی اور چھوٹی باتوں کا خیال رکھے۔

پھر اپنی زندگی اور جن حالات سے وہ گزرا تھا' ان ہی سے عبرت حاصل کرنے کے لیے اسی وصیت نامے میں یہ بھی لکھوایا۔

اللہ کی نعمتیں جن لوگوں کے لیے پوری کی گئی ہوں 'ان کو چاہیے کہ دنیا کو اسی جگہ پر رکھیں جو اس کا واقعی مقام ہے۔ یعنی جن لوگوں کے حقوق ان کے ذمے عائد ہوئے ہیں 'ان کو ادا کریں اور بڑے بننے کا خیال دل سے نکال دیا جائے 'کہ دنیا میں بڑے بننے کی گنجایش ہی نہیں رکھی گئی ہے 'کیونکہ دنیا ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ ایک راستہ ہے جس سے آدمی گزر جاتا ہے۔ بہرحال اس راستے سے گزرنے کے بعد خدا کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ بس اسی خدا سے میں لوگوں کو چونکاتا اور ڈراتا ہوں 'اور میں وصیت کرتا ہوں کہ اس گھر میں داخل ہونے سے پہلے جس سے واپسی ناممکن ہے 'اور واپسی کے دروازے جس گھر میں پہنچنے کے بعد بند ہو جاتے ہیں 'لوگو! ان نیکیوں کے حاصل کرنے میں جلدی کرو 'جن سے محروم ہونے والے محروم ہو ہو کر جا رہے ہیں۔

زیاد پر جزع فزع کی حالت طاری تھی 'اس کا مشہور بیٹا جسے فاجعہ کربلا کے کرتوتوں نے رسوائے زمانہ بنا رکھا ہے وہی ابن زیاد باپ کی بالیں پر کھڑا کہہ رہا تھا: "ابا جان! آپ گھبرائیے نہیں 'میں نے

آپ کے کفن کے لیے ساٹھ تھان کپڑوں کے پہلے سے فراہم کر کے رکھ لیے ہیں"۔

مطلب اس بدبخت ابن زیاد کا شاید یہ تھا کہ آپ کا جنازہ بڑے دھوم دھام سے نکالوں گا۔ چند گزوں کی جگہ جس مرنے والے کے لیے ساٹھ ساٹھ تھان کا انتظام صرف کفن دینے کے واسطے تیار رکھا گیا ہو' اس کے لیے اور کیا کیا نہ کیا جائے گا۔ لیکن باپ 'ابن زیاد نہیں ' زیاد تھا۔ بڑے بڑوں کی صحبت اس کو میسر آئی تھی 'گو اس صحبت سے فائدہ اٹھانے کا موقع جیسا کہ چاہیے اس کو نہ ملا۔ تاہم بیٹے کی طرح باپ اتنا احمق نہ تھا۔ لکھا ہے کہ جھنجلا کر ابن زیاد کو زیاد نے جواب دیا :

میرے بیٹے! تیرے باپ کے سر پر وہ گھڑی آکر کھڑی ہوگئی ہے 'جس کے بعد نہیں کہا جاسکتا کہ جو لباس اس وقت اس کے بدن پر ہے ' اس سے بہتر لباس سے نوازا جائے گا ' یا یہ بھی جو کچھ ہے ' وہ بھی جلد ہی چھن جائے گا۔ (طبری ' ج ۵ ' ص ۱۲۶)

' کسی کو زیاد کے اس حال پر رحم آگیا ' اور جیسا کہ دستور ہے 'تسلی دیتے ہوئے اس نے کہا کہ آپ مایوس نہ ہوں ' میں آپ کو بشارت دیتا ہوں ۔ بیان کیا گیا ہے ' اس وقت اس کے کمزور حافظے میں اپنی گزری ہوئی ناکردنیوں کی یاد ایک ایک کر کے جاگ رہی تھی ۔ خدا ہی جانتا ہے ناحق کتنوں پر اس نے زندگی تنگ کی تھی ' اس کی گردن پر کتنے ناحق خونوں کا وبال لپٹا ہوا تھا۔ خصوصاً کوفہ کے ایک بزرگ جن کا نام ابو المغیرہ (۱) تھا ' اس نے بلاوجہ صرف اس لیے ان کو قتل کرا دیا تھا کہ عوام پر ان کا اثر ہے (۲)۔ لوگ ان کے تقویٰ ' زہد و عبادت کے معترف تھے ۔ یہ فعل زیاد سے اس وقت صادر ہوا تھا جب "الامیر" یا "گورنر" ہونے کے سوا اس کے حافظے میں کسی چیز کی یاد بیدار نہ تھی ۔ مگر اس وقت وہی باتیں جو اس کے دماغ میں دفن ہوتی چلی گئی تھیں ' آنکھیں مل مل کر سامنے آ آکر کھڑی ہو رہی تھیں ۔ ان ہی میں ابو المغیرہ کا کٹا ہوا سر بھی تھا ۔ اور لہو میں ڈوبا ہوا وہ جسد بھی جو تڑپ تڑپ کر اس کے سامنے ٹھنڈا ہوا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ بشارت کی جھوٹی طفل تسلی کو سن کر زیاد کی زبان پر بے ساختہ یہ فقرہ جاری ہوا۔

بشارت کیسے ؟ راستے پر دیکھو! ابو المغیرہ کھڑے ہوئے ہیں ۔ (ابن عساکر ' ص ۴۲۲)

دیکھا گیا کہ یہی بولتے ہوئے ' بولنے والا چپ ہو گیا اور ایسا چپ ہوا کہ پھر کسی نے اس کی کوئی آواز نہ سنی ۔ تو یہ نامی کوفہ کے قبرستان میں زیاد کی لاش مٹی کے نیچے دبا دی گئی ۔ بجلی کی طرح زیاد کی موت کی خبر ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی ۔ کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ ان کی دعا قبول ہوگئی اور حجاز کا گورنر ہونے سے پہلے زیاد مرگیا ' تو فرمایا :

سمیہ کے بیٹے ! لے ' نہ دنیا ہی تیرے لیے باقی رہی ' اور نہ آخرت ہی (کی راحت کو) تو پا سکا۔

ابن عمرؓ کے اس فقرے کے یہ الفاظ — "لا الدنیا بقیت لک ولا الاخرۃ ادرکت" "نہ تیرے پاس دنیا باقی رہی اور نہ ہی تجھے آخرت ملی" — سیاسی کاروبار میں زندگی گزارنے والوں کے لیے غور کیا جائے تو ایک عبرت آموز تاریخی سبق ہے۔ خود یہی زیاد کوفہ کے گورنر ہاؤس میں بیٹھا کرتا تھا کہ ایک بلی آئی اور کسی گوشے میں بیٹھ کر چوہے کا انتظار کرنے لگی۔ دن ختم ہو گیا' آفتاب غروب ہو رہا تھا کہ کہیں سے کوئی بدبخت چوہا نکل پڑا۔ بلی نے اسے دبوچ لیا۔ ایک صاحب جو زیاد کے ساتھ دیر تک اس تماشے کو دیکھ رہے تھے' وہی کہتے تھے کہ 'میری طرف مخاطب ہو کر زیاد نے کہا:" اس بلی سے ان لوگوں کو سبق سیکھنا چاہیے کہ جو کسی مہم کو سر کرنا چاہتے ہیں"۔

مطلب یہی تھا کہ غروب ہی کے وقت سہی' لیکن بلی بالآخر کامیاب ہو کر رہی۔ دراصل یہ خود زیاد کی زندگی تھی۔ طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق "جس سال مکہ فتح ہوا' زیاد طائف میں پیدا ہوا' کوفہ میں ۵۳ھ میں اس وقت مرگیا جب کوفہ کا گورنر امیر معاویہؓ کی طرف سے تھا" (ص ۷' حصہ اول' ص ۱۷)۔

گویا زیاد کی عمر بہ مشکل ۴۵ سال ثابت ہوتی ہے ای روایت کو مان لیا جائے کہ ہجرت کے سال وہ پیدا ہوا تو زیادہ سے زیادہ ۵۲ سال تک ہی جینے کا موقع' ماننا پڑے گا کہ اس کو ملا' مگر کوفہ اور بصرہ کی گورنری کی مدت' اس کی پوری عمر خواہ ۴۵ ہو یا ۵۲ ہو' لے دے کر کل ۵ سال ہے۔ طبری نے زیاد کے غلام فیل کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ "عراق پر زیاد نے کل پانچ سال حکومت کی"۔

اس پانچ سال میں بھی زیاد جیسے سیاسی بازی گر کو' جو صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے اس کی قطعاً پروا نہ کرتا تھا کہ جن ذرائع کو اختیار کر رہا ہے وہ صحیح ہیں یا غلط' جوڑ توڑ کے سلسلے میں جن الجھنوں میں الجھنا پڑا ہو گا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں' جو اس قسم کی غلط سیاسی زندگی کے طوفانوں میں خود کو ڈال کر ان ہی تجربات میں سے گزر رہے ہیں' جن سے زیاد گزرا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان غریبوں کو چین اور سکھ' آسودگی اور طمانیت کے چند لمحات بھی اپنی ساری جاہی بلندیوں کے باوجود نصیب ہو جائیں' تو غنیمت ہے' دوسروں کو ان غریبوں کی زندگی خواہ جس حد تک قابل رشک نظر آتی ہو' لیکن خود ان کو اپنے آپ میں واپس ہونے کا موقع کبھی جب مل جاتا ہے' اگرچہ یہ موقع بھی ان کو بہت کم نصیب ہوتا ہے' تو ہر دو سرے کی زندگی ان ہی کے لیے باعث غبطہ و رشک بن جاتی ہے۔

دنیا یوں ہاتھوں میں آنے کے بعد ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور دنیا کے بعد زندگی کی جو منزلیں ان کے سامنے آتی ہیں' ان میں اپنے ٹیڑھے نتائج و انجام کو ظاہر ہے سیدھی شکلوں میں کیسے پا سکتے ہیں' گویا سیاسی پیشہ وروں ہی کے متعلق طبلہ کی تھاپ میں سننے والوں کو شاید یہ سنایا گیا تھا کہ:

درپے دنیا دین ہم رفت آں ہم رفت و ایں ہم رفت

(دنیا حاصل کرنے کی خواہش میں ' دین ہی ہاتھ سے گیا ' وہ بھی گئی ' یہ بھی گیا)

---

(۱) ابن عساکر کا بیان ہے کہ کوفہ کا امیر ہونے کے بعد زیاد پہلی دفعہ جب پہنچا ' اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ کوفہ والوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار ابو المغیرہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی وقت ان کو طلب کر کے اس نے حکم دیا کہ میں کافی مالی معاوضہ آپ کو دوں گا۔ آپ گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیں۔ ابو المغیرہ نے کہا ' سبحان اللہ مسلمان آدمی یہ کیسے کر سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو نماز ہی کے لیے گھر سے نکلنے پر مجبور ہے۔ ماسوا اس کے مسلمانوں کی عیادت ' ان سے ملنے جلنے کے لیے باہر نکلنا میرا دینی فریضہ ہے۔ ساری دنیا بھی مجھے مل جائے جب بھی ان دینی امور سے دست بردار ہونے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ زیاد نے کہا ' خیر ان باتوں سے میں منع نہیں کرتا ' لیکن پبلک سے کوئی تعلق نہ رکھو ' جواب میں ابو المغیرہ نے کہا کہ مسلمانوں کو بری بھلی باتوں سے آگاہ نہ کروں ' یہ بھی مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ زیاد نے کہا کہ ابو مغیرہ تو پھر تمھاری پناہ گاہ اب صرف تلوار ہے۔ بولے ' تلوار؟ اس سے مجھ کو کب انکار ہے۔ بدبخت نے حکم دیا اور بے چارے ابو مغیرہ کی گردن اڑا دی گئی۔ اور یہ تو ایک چیز کی مثال ہے۔ عرض کر ہی چکا ہوں کہ حجاج کے مقتولوں کی تعداد خواہ زیاد ہو لیکن مسلمانوں کے قتل کرنے میں زیاد جتنی لاپرواہیوں سے کام لیتا تھا ' حجاج اتنا غیر محتاط نہ تھا۔

(۲) ابو مغیرہ کو دیکھ کر زیاد نے کہا تھا "اگر یہ بدکا تو سارا کوفہ اس کے ساتھ بدک جائے گا"۔

قارئین کی توجہ کے لیے

ترجمان القرآن کے موجودہ دور کا پہلا ' جنوری ۹۴ کا ' شمارہ دوبارہ طبع کروایا گیا ہے۔ جن اصحاب کو اس کی ضرورت ہو ' ۱۲/- روپے فی شمارہ کے حساب سے طلب فرما سکتے ہیں۔

مینیجر ترجمان القرآن

۵ ' اے ذیلدار پارک ' اچھرہ ' لاہور

گئے ' فلم اور پھر ٹیلی ویژن نے آ کر رہی سہی کسر پوری کر دی اور تعمیر و تشکیل کے یہ موثر اور مفید ذرائع اشاعت فحش کے ذرائع بن گئے۔ عورت ایک ماڈل اور شے تجارت بن کر رہ گئی۔ نفس کی تسکین کے لیے کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانی زندگی درہم برہم ہو گئی ' زنا کاری عام ہوئی اور اسے برا سمجھنے کا رجحان بھی کمزور پڑ گیا۔ مغرب کے ذرائع خود ہی اعداد و شمار جمع کر کے بتاتے رہتے ہیں کہ کتنے منٹ میں کتنی عصمتیں لٹتی ہیں ' کتنے خاندان تباہ ہو رہے ہیں ' کتنے خاندان واحد والدین ' پال رہے ہیں اور معصوم بچے کن کن نفسیاتی مسائل سے دوچار ہیں۔ ہدایت الٰہی سے بغاوت کر کے زندگی گزارنے کے جو نتائج معاشرتی زندگی میں آئے ' آج مغرب کے طبع سلیم رکھنے والے اہلِ فکر کو بھی پریشان کیے ہوئے ہیں۔

آج کے مغرب میں عورت ایک مظلوم ہستی ہے۔ جب مشرقی یورپ پر سے کیمونزم کا آہنی پردہ اٹھا ' اور وہاں کی معاشرتی زندگی سامنے آئی تو خود مغرب کے رسائل و جرائد نے نقشہ کھینچا کہ کس طرح ایک ڈالر کے لیے اور ایک وقت کے کھانے کے لیے وہاں کی عورت عصمت لٹانے کو سڑکوں پر کھڑی ہے۔ نسوانیت کی اس سے زیادہ تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ دوسری طرف چین میں جہاں ایک ارب سے زیادہ انسان بستے ہیں ' صرف ایک بچے کی اجازت کی پالیسی کی وجہ سے ۵ لاکھ لڑکیاں رحم مادر میں پیدا ہوتے ہی قتل کر دی جاتی ہیں۔ بھارت کی کہانی بھی مختلف نہیں۔ عربوں کا دورِ جاہلیت خواہ [illegible]ی بدنام ہے۔

لیکن لطف یہ ہے کہ مغرب کو سب سے زیادہ فخر اسی بات پر ہے کہ اس نے عورت کو حقوق دیے ہیں اور ایک مقام دیا ہے۔ اسے معاشرے ' مذہب اور اخلاقی اقدار کے بندھنوں سے آزاد کر دیا ہے ' اب اسے اختیار ہے کہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرے کہ کس حمل کو رکھے ' کسے ضائع کرے ' چاہے مرد کے ساتھ زندگی گزارے ' چاہے عورت کے ساتھ ' اور جب چاہے ساتھ چھوڑ دے۔ لیکن مثبت بات یہ ہے کہ یہ فیصلے کرنے کے لیے اسے تعلیم ملنا چاہیے ' صحت کے لیے سب سہولتیں فراہم ہونا چاہییں اور ملازمت اور کاروبار کے مواقع ملنا چاہییں۔

مغرب کا دوسری تہذیبوں پر ' خصوصاً اسلام پر ' سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نے عورت کو ثانوی حیثیت دے کر جائز حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ مرد جب چاہے عورت کو طلاق دے دے ' چار چار شادیاں کرے ' بڑے بڑے حرم رکھے۔ اسے وراثت میں حصہ بھی نصف ملتا ہے ' اس کی دیت بھی آدھی ہے اور گواہی بھی نصف شمار ہوتی ہے۔ اسے نہ تعلیم مہیا ہے ' نہ علاج کی سہولت۔ ہر طرح کا ظلم اس پر روا ہے ' جس کی نہ داد ہے نہ فریاد۔ اس کے فیصلے اس کے مرد کرتے ہیں۔ اسے اپنے جسم

پر کوئی اختیار نہیں ۔ وہ پابند ' مجبور اور مظلوم ہے ۔ اسے جاہل اور پسماندہ رکھا جاتا ہے ۔

ایک جارح اور غالب تہذیب کی شان کے ساتھ 'مغرب کی یہ کوشش ہے کہ تیسری دنیا اور مسلم ممالک میں عورت کے بارے میں اپنی اقدار اور تصورات رائج کرے ۔ ایک منظم منصوبے کے تحت اقوام متحدہ کی سرپرستی میں عالمی کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ۔ میکسیکو (۱۹۷۵) ' کوپن ہیگن (۱۹۸۰) اور نیروبی (۱۹۹۰) کے بعد اب ۱۸۹ ممالک کے پانچ ہزار چار سو مندوبین اور ۳۰ ہزار خواتین پر مشتمل غیر سرکاری وفود کی بیجنگ میں کانفرنس ہوئی ہے ۔ ۱۴ ستمبر کو اس ۱۱ روزہ کانفرنس کا اختتام ہوا ۔ پہلے سے ایک ایجنڈا فراہم کر دیا گیا جو دنیا بھر میں موضوع بحث بنا ۔ کانفرنس نے ایک پلیٹ فارم فار ایکشن 'منظور کر کے ' حکومتوں کو راہ عمل دکھائی ہے کہ انھیں خواتین کے حقوق کے لیے کیا کرنا ہے ۔ عمل تو جو ملک جتنا کرے ' لیکن محض کانفرنس کا انعقاد ' اس کے موضوعات کا زیر بحث آنا ' حکومتوں اور غیر سرکاری انجمنوں (این جی اوز) کی اس بڑے پیمانے پر شرکت ' اس ایجنڈے کا آگے بڑھنا ہے ' جو مغرب کے پیش نظر ہے ۔ اسے آگے بڑھانے کے لیے صرف کانفرنس ہی واحد ذریعہ نہیں ' بین الاقوامی ٹی وی نیٹ ورک ' اور خود تیسری دنیا اور مسلم ممالک کی اپنی حکومتیں ' اور ان کے ذرائع ' اس میں پیش پیش ہیں ۔ اس کانفرنس پر تبصروں میں یہ بات مشترک طور پر کہی گئی ہے کہ یہاں دو مختلف نقطہ ہائے نظر کی کشمکش رہی ۔ مغرب کا لبرل اور دوسرا قدیم روایتی جسے اسلامی اور کیتھولک لابی نے آگے بڑھایا ' یعنی ایک ہدایت الٰہی سے بغاوت پر مبنی رویہ اور دوسرا اس کے اتباع کا رویہ ۔

امت مسلمہ کی ہدایت الٰہی کی حامل قوموں کی 'بدنصیبی ہے کہ ان کے معاشروں کی عملی تصویر کہ مغرب کو الزامات لگانے اور مصلح بن کر آگے بڑھنے کا جواز فراہم کرتی ہے ۔ پھر وہ شریعت کو زد میں لے آتے ہیں اور اپنی اقدار کی ترویج کے لیے تدابیر تجویز کرتے ہیں ۔ ان کانفرنسوں کا ایک مقصد بجا طور پر یہ رہا ہے کہ خواتین کے لیے تعلیم عام ہو ' علاج کی سہولت فراہم ہو اور انھیں عزت و وقار ملے ۔ اس لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی مسلم ممالک فی صد کے حوالے عموماً دنیا میں سب سے نیچے آتے ہیں ۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے اس کانفرنس کے موقع پر اقوام متحدہ کے لیے تیار کردہ رپورٹ میں ترقی کے جو نئے اشارے متعارف کروائے ' ان کی رو سے بھی مسلم ممالک سب سے نیچے ہیں ۔ اب افغانستان میں طالبان کے لڑکیوں کے اسکول بند کرنے سے عالمی میڈیا کو ایک اور موضوع مل گیا ہے ۔ پاکستان کی مثال لیں ' اس بحث میں نہ پڑیں کہ لڑکوں کی تعلیم کی کیا صورت حال ہے ' اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لڑکیوں کی تعلیم خاص طور پر بے توجہی کا شکار ہے ۔ دیہی خواتین میں خواندگی کی شرح کیا ہے ۔ یقیناً اس میں اسلام کا کوئی قصور نہیں ' لیکن مغرب کی نظر میں اصل ملزم اسلام ہی ٹھہرتا

ہے ۔ اس طرح علاج کی سہولتوں کا معاملہ ہے ۔ اسلام نے اس سے نہیں روکا کہ خواتین کو علاج کی سہولت فراہم ہو لیکن اگر مسلم ممالک میں عموماً اس میں لاپرواہی برتی جاتی ہو تو اسلام ہی پر الزام آتا ہے ۔ عورتوں کو جو حقوق اسلام نے دیے ہیں ' وہ عورتوں کو حاصل نہیں ہیں ۔ یہ ایک امر واقعہ ہے جسے سب تسلیم کرتے ہیں ۔ یہ دعوے تو بہت ہیں کہ اسلام نے عورت کو جب یہ حقوق دیے ' اس وقت دنیا ان کا تصور تک نہ رکھتی تھی ۔ آج کی مسلمان عورت رسوم و رواج کے بندھنوں میں اتنی جکڑ گئی ہے اور حقیقتاً اتنی مظلوم ہے ' الا ماشاء اللہ ' احیائے اسلام کی جدوجہد کا ایک پہلو یہ بھی ہونا چاہیے کہ خواتین کو ان کے وہ حقوق دیے جائیں جو اسلام نے ان کو دیے ہیں ۔ اگر مسلمان معاشروں میں عورت کو وہ باعزت مقام فی الواقع ملے جو اسلام اسے دیتا ہے تو مغرب کو اعتراض کرنے کے لیے کچھ نہ ملے گا بلکہ ان کی تہذیب کی ستائی ہوئی مظلوم عورت ' اسلام کی طرف آئے گی ۔ موجودہ گئی گزری صورت حال میں بھی جو سعید روحیں اسلام کی تعلیمات تک پہنچتی ہیں ' اور مسلمانوں کے طرز عمل کو بنیاد نہیں بناتیں ' اسلام کی طرف آرہی ہیں ۔

بیجنگ کانفرنس نے ضبط تولید اور اسقاط حمل کے بارے میں مختلف ممالک کو خود پالیسی بنانے کی گنجایش دی ہے ۔ یہ اسلامی موقف پیش کرنے والی حکومتوں اور رومن کیتھولک عناصر کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ مسلم حکومتوں کو خواتین کے حقوق کے لیے مغلوب اور مرعوب ذہنیت کے بجائے ' اللہ کی ہدایت کے درست ہونے پر مکمل ایقان کے ساتھ ' اپنی پالیسیاں تشکیل دینا چاہییں اور افراط و تفریط سے بچتے ہوئے ' اعتدال کی راہ اختیار کرنا چاہیے ۔ خواتین کی موجودہ صورت حال حق رکھتی ہے کہ اسے غیر معمولی اہمیت دی جائے اور اپنی تہذیب و روایات کی روشنی میں اسے حل کیا جائے ۔ خواتین کے بارے میں پاکستان نے جو سرکاری رپورٹ پیش کی اس میں حدود کو نشانہ بنایا گیا ۔ تین بڑے مسلم ممالک میں خواتین وزرائے اعظم کو اسلامی معاشروں میں عورت کو مقام نہ دینے کے جواب میں برہان قاطع کے طور پر پیش کیا جاتا ہے حالانکہ اصل مسئلہ چند عورتوں کا کوئی مقام حاصل کرنا نہیں ہے ۔ اگر یہ مقام مغرب کا پسندیدہ ہے ' اور اسلام کو مطلوب نہیں ہے ' تو آخری تجزیہ میں اس سے مسلمان معاشروں میں عورتوں کے حقوق کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسلمان عورت کو اس کے حقوق ملیں ' اس کے وہ حقوق جو اس کے خالق و مالک نے اپنے ضابطہ ہدایت میں اسے عطا کیے ہیں اور جن کے سلب کیے جانے کی وجہ سے آج کے مسلمان معاشروں میں بھی وہ پریشان حال اور مظلوم ہے ۔

بیجنگ کانفرنس خواتین کے لیے دعوت عمل ہے ۔ کانفرنس نے تو مغرب زدہ خواتین کو آگے

بڑھنے کے لیے لائحہ عمل دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا اصل پیغام مسلم راہ نماؤں کے لیے 'اور تعلیم یافتہ قائد مسلم خواتین کے لیے ہے۔ حقیقتاً یہ ان کے لیے دعوت عمل ہے۔ وہ مسلم معاشروں کی اسلام کی صحیح تعلیمات کی روشنی میں صورت گری کریں۔ عورت کو اس کا حقیقی مقام دیں۔ اس مثبت جدوجہد کو ایک مہم اور تحریک بنا کر چلائیں۔ اس میں پیش آنے والی مزاحمتوں کا مقابلہ کریں۔ یہ بیجنگ کانفرنس کا صحیح جواب ہو گا اور وہ دن قریب آئے گا جب خود مغرب اپنے نظام کے مفاسد سے عاجز آ کر اسلام میں عورت کے مقام کو فطرت و ضرورت کے مطابق تسلیم کر کے اس کی طرف رجوع کرے گا۔ اس لیے کہ ہدایت الٰہی کے مطابق عورت کو اس کا حقیقی مقام دے کر زندگی گزارنے سے معاشرتی زندگی میں چین و سکون ملے گا۔ آج اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ 'اسلامی تعلیمات پر عمل نہ ہونا ہے۔ مسلمانوں کے پاس نسخہ کیمیا ہے 'مگر وہ غیروں کے ایسے اسیر ہو گئے ہیں کہ اپنی دولت کا احساس کھو بیٹھے ہیں۔ ان کے معاشرے اسلام کا نمونہ بن جائیں تو دنیا فوج در فوج داخلے کا منظر بھی دیکھ لے گی۔

جموں وکشمیر پر بھارتی دعویٰ --- ایک تاریخی جائزہ

الیسٹر لیمب

ترجمہ: محمد اقبال فاروقی

ریاست جموں وکشمیر کے اندرونی معاملات میں بھارت کی جارحانہ مداخلت کا آغاز پہلی بار ۲۷ اکتوبر ۴۷ کو تقریباً ۹ بجے صبح ہوا جب بھارتی فوجی دستوں نے سری نگر کے ہوائی مستقر پر اترنا شروع کیا۔ بھارت نے اپنے اس دعوے کا کہ ریاست جموں وکشمیر بھارت کا ایک حصہ ہے' سرکاری طور پر آغاز بھی چند گھنٹے قبل ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ کی شام کو کیا۔ ۲۷ اکتوبر ۴۷ کو اپنی آمد سے آج تک بھارتی افواج جموں وکشمیر کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کیے بیٹھی ہیں حالانکہ یہاں کی آبادی کی بھاری اکثریت کی طرف سے ان کی روز افزوں کھلم کھلا مخالفت شدت اختیار کر چکی ہے۔ جموں وکشمیر میں بھارت کی پوزیشن اور اس کی کارگزاریوں کے نکتہ چینوں کے لیے حکومت نئی دہلی کا ہمیشہ سے ایک ہی یہ جواب ہوتا ہے کہ ریاست پوری طرح بھارتی نظام حکومت کا اندرونی معاملہ ہے۔ کیا حقائق بھی بھارت کے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں؟ آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر برطانوی ہند کی ایک جاگیردارانہ ریاست تھی۔ ۱۹۴۷ میں انتقال اقتدار کے برطانوی قواعد کے تحت ریاست کا حکمران مہاراجہ سر ہری سنگھ برطانیہ کی ہندستان سے واپسی اور کسی اقتدار اعلیٰ کی عدم موجودگی کے باعث (جیسا کہ تاج برطانیہ اور ریاست کے درمیان طریقہ کار طے ہو چکا تھا) بھارت یا پاکستان کے ساتھ شامل ہو سکتا تھا یا کسی کے ساتھ بھی الحاق نہ کرنے کی صورت میں وہ ۱۵ اگست ۴۷ کو خود مختار ریاست کا حکمران بن سکتا تھا۔ یہ انتخاب خود حکمران کو کرنا تھا۔ برطانوی راج کے آخری دنوں میں ہندستانی ریاستوں کے نوابوں اور راجوں کے لیے عوامی تائید حاصل کرنے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ اس طرح ۱۵ اگست کو قواعد کی اس خامی کے باعث ریاست جموں وکشمیر آزاد و خود مختار ریاست بن گئی تھی۔

بھارت کا موقف یہ ہے کہ خود مختاری کا یہ دور، جس کو کبھی کسی نے چیلنج نہیں کیا' ۲۶-۲۷

اکتوبر ۴۷ کو ختم ہو گیا تھا کیونکہ اس نے مہاراجہ کے ساتھ باہمی طور پر دو متعلقہ دستاویزات کے تحت معاملات طے کر لیے تھے:

(الف) جموں و کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی دستاویز جس کے بارے میں مبینہ طور پر کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ نے ۲۶ اکتوبر ۴۷ کو اس پر دستخط کر دیے تھے۔ (ب) بھارت کے گورنر جنرل لارڈ ماونٹ بیٹن کی طرف سے اس کی ۲۷ اکتوبر ۴۷ کو منظوری (ج) ۲۶ اکتوبر ۴۷ کو مہاراجہ کی طرف سے لارڈ ماونٹ بیٹن کے لیے ایک خط جس میں بھارت کے ساتھ الحاق کے عوض ' ان شرائط کے تحت جو مبینہ طور پر ایک مشمولہ دستاویز میں بیان کی گئی تھیں ' اس سے فوجی امداد طلب کی گئی تھی۔ اور شیخ عبداللہ کا بحیثیت عبوری حکومت کے سربراہ کے تقرر۔ (د) اور ۲۷ اکتوبر ۴۷ کو لارڈ ماونٹ بیٹن کی طرف سے مہاراجہ کے نام ایک خط جس میں متذکرہ بالا دستاویز کی وصولی کا ذکر تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ ایک بار ریاست کے معاملات درست ہو گئے اور امن عامہ اور نظام مملکت بحال ہو گیا تو "ریاست کے الحاق کا مسئلہ ' عوام کی رائے سے طے کیا جائے گا"۔

اب دیکھیے کہ مہاراجہ کی جانب سے اطلاع کی تاریخ ' مبینہ دستاویز الحاق یا ماونٹ بیٹن کے نام مکتوب ' دونوں دستاویزات میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ دی گئی ہے یعنی ۲۷ اکتوبر کی اس صبح سے قبل جب بھارتی فوجوں نے ریاست کے معاملات میں کھلم کھلا مداخلت شروع کی۔ کہا جاتا ہے کہ ماونٹ بیٹن نے آزاد ریاست کے معاملات میں مداخلت کے لیے اپنی منظوری سے قبل مہاراجہ کے دستخطوں کی شرط پر اصرار کیا تھا۔ عموماً ۲۶ اکتوبر ۴۷ کی تاریخ آج تک تمام مبصرین کی طرف سے خواہ وہ بھارتی دعوے کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں یا معاندانہ ' درست تسلیم کی گئی ہے۔ یہ بات یکم نومبر ۴۷ کو بھارت کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ماونٹ بیٹن کی طرف سے ایم۔ اے جناح ' گورنر جنرل پاکستان کے نام ایک سرکاری مراسلے میں موجود ہے ' اور جموں و کشمیر کے مسئلے پر اس قرطاس ابیض میں جو مارچ ۴۸ میں حکومت بھارت نے بھارتی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا اس میں بھی اس دعوے کو دہرایا گیا ہے لیکن پاکستانی سفارت کاروں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ تازہ تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ الحاق کی یہ تاریخ غلط ہے۔ یہ حقیقت قدیم دستاویزات سے بھی ظاہر ہوتی ہے اور جموں و کشمیر کے اس وقت کے وزیراعظم مہرچند مہاجن کی یادداشتوں سے اور بھارتی وزیراعظم جواہرلال نہرو کی حال میں طبع شدہ خط و کتابت سے بھی عیاں ہے۔ ۲۶ اکتوبر ۴۷ کے واقعات کا خاص طور پر وی۔ پی مینن (بھارتی ریاستوں کا انضمام ' لندن ۱۹۵۶) کا یہ بیان کہ جب مہاراجہ نے دستخط کیے تھے وہ اس وقت وہاں موجود تھا حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

اب یہ اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ دستاویز الحاق اور مہاراجہ کا ماونٹ بیٹن کے نام خط ' دونوں

دستاویزات پر ۲۶ اکتوبر ۴۷ء کو مہاراجہ کے دستخط ممکن نہیں ہو سکتے۔ ان کے دستخطوں کے لیے سب سے پہلا ممکنہ وقت اور تاریخ ۲۷ اکتوبر ۴۷ء کی سہ پہر ہے کیونکہ ۲۶ اکتوبر ۴۷ء کو تو مہاراجہ سری نگر سے جموں کے لیے سڑک کے راستے سفر میں تھا جبکہ اس روز اس کا وزیر ایم۔سی مہاجن، حکومت ہند کے ریاستی معاملات کے نگران ایک سینئر بھارتی افسر وی۔پی مینن کے ساتھ دہلی میں مذاکرات کر رہا تھا۔ ان دونوں نے دہلی میں رات بھر قیام کیا جہاں ان کی موجودگی کے بہت سے گواہ ہیں۔ نئی دہلی اور محو سفر مہاراجہ کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا۔ مینن اور مہاجن نئی دہلی سے جموں کے لیے ۲۷ اکتوبر ۴۷ء کو دس بجے صبح بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوئے اور مہاراجہ کو پہلی بار ان دونوں سے دہلی میں اپنے وزیراعظم کے پہلے دن کی سہ پہر (۲۶ اکتوبر) کے مذاکرات کے نتیجے کا علم ہوا۔

کلیدی نکتہ جو اب بالکل واضح ہو چکا ہے یہ ہے کہ ان دستاویزات پر دستخط ریاست جموں و کشمیر میں بھارت کی کھلم کھلا مداخلت کے بعد ہی ممکن تھے۔ اور جب بھارتی فوجی دستے سری نگر کے ہوائی اڈے پر اترے تو ریاست اس وقت خود مختار تھی۔ بھارتی مفاد والا کوئی ایسا معاہدہ جس پر مبینہ مداخلت کے بعد مہاراجہ کے دستخط لیے گئے ہوں اس الزام سے بَری نہیں ہو سکتا کہ یہ دستخط دباؤ کے تحت حاصل کیے گئے تھے۔ اس الزام سے بچنے کے لیے ۲۶ اکتوبر ۴۷ء کی جھوٹی تاریخ' ان دستاویزات پر ڈالی گئی ہے۔ وی۔پی مینن نے جو ایک انتہائی ذمہ دار بھارتی سینئر سرکاری افسر تھا' جان بوجھ کر حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ یہ جعل سازی ساری دستاویزات کے جواز کو مشکوک بنا دیتی ہے۔

ان چاروں دستاویزات میں طے پانے والے معاہلے کا نئی شہادتوں کی روشنی میں اگر جائزہ لیا جائے تو دوسرے متعدد شکوک سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں تک دستاویز "ج" اور "د" کا تعلق ہے' یعنی مہاراجہ اور مونٹ بیٹن کے درمیان خطوط کا تبادلہ' تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جس خط کا مونٹ بیٹن نے جواب دیا تھا اس خط کو پہلے دہلی پہنچنا چاہیے تھا (لیکن معاملہ الٹ ہوا' جواب پہلے آیا اور خط بعد میں لکھوایا گیا)۔ غالب امکان بھی اسی کا ہے کہ ۲۷ اکتوبر ۴۷ء کو اس دستاویز کو جموں پہنچانے سے قبل دونوں دستاویزات حکومت نئی دہلی نے اس وقت مرتب کرائیں (یعنی وی۔پی مینن اور جموں و کشمیر کے وزیراعظم ایم۔سی مہاجن نے تیار کی تھیں) جب بھارتی افواج سری نگر کے فضائی مستقر پر اتر چکی تھیں (ان دونوں کی نقل و حرکت ۲۸ اکتوبر ۴۷ء کے لندن ٹائمز میں ضمناً پوری طرح رپورٹ کی گئی تھی) اس لیے یہ موقف بہت مضبوط ہے کہ دستاویز "ج" یعنی مہاراجہ کا مونٹ بیٹن کے نام خط مہاراجہ کو dictate کرایا گیا تھا۔ دستاویزات "ج" اور "د" ۲۸ اکتوبر ۴۷ء کو حکومت ہند کی طرف سے شائع کی گئیں۔ لیکن زیادہ اہمیت کی حامل دستاویز "الف" یعنی مبینہ دستاویز الحاق کو' اگر فی الواقع اس کا کوئی وجود تھا' کئی سال بعد تک شائع نہیں کیا گیا اور نہ ریاست جموں و کشمیر

میں بھارت کی کھلم کھلا مداخلت کے آغاز کے بعد یہ پاکستان کے حوالے کی گئی۔ سنہ ۱۹۴۸ میں اس کی نقل اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں بھارتی درخواست کے ساتھ پیش کی گئی۔ ۱۹۴۸ کا قرطاس ابیض جس میں حکومت ہند نے ریاست جموں و کشمیر پر اپنے دعوے کے بارے میں اپنا سرکاری موقف پیش کیا ہے اس میں بھی یہ دستاویز الحاق شامل نہیں ہے جس پر مہاراجہ کے دستخطوں کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس کے بجائے یہ پھر اسی غیر دستخط شدہ دستاویز کو دوبارہ پیش کرتی ہے جس کے بارے میں یہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے کہ مہاراجہ نے اس پر دستخط ثبت کیے تھے۔ بہرکیف آج تک کوئی ایسی تسلی بخش حقیقی دستاویز جس پر مہاراجہ نے دستخط کیے ہوں، پیش نہیں کی جا سکی۔ حالیہ شہادت کے مطابق یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا کہ مہاراجہ نے کسی دستاویز الحاق پر کبھی دستخط کیے تھے۔ البتہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے برعکس اس طرح کے شواہد موجود ہیں جن کی رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مہاراجہ نے اس طرح کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔

دستاویز الحاق کا حوالہ دستاویز "ج" میں دیا گیا ہے۔ (ج) ایک خط ہے جسے بھارتی افسروں نے مہاراجہ کی طرف سے، اسے دکھائے بغیر تیار کیا تھا۔ جس وقت یہ خط تیار کیا گیا دستاویز الحاق کا کوئی وجود نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا۔ اگر بہ فرضِ محال کوئی دستاویز الحاق تھی بھی، اور وہ اس غیر دستخط شدہ دستاویز کے مطابق تھی جو بھارتی قرطاس ابیض میں ۱۹۴۸ میں طبع ہوئی تو یہ تو حکومت ہند کو نہایت محدود اختیارات دیتی تھی۔ ریاست کی طرف سے حکومت ہند کو اس دستاویز کی رو سے جو زیادہ سے زیادہ اختیارات منتقل ہوئے تھے، وہ دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کے بعض امور تھے۔ عملاً دیگر سب اختیارات ریاستی حکومت کے پاس تھے۔ جنوری ۱۹۵۰ کے بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ غنیمت تھی (جس کی رو سے پہلے کی دیگر ہندستانی ریاستوں کے برعکس کشمیر کو بھارتی آئین میں نظری طور پر، عملاً نہ سہی، کسی قدر اہم حیثیت دی گئی تھی) جس کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو کسی حد تک حق خود اختیاری حاصل تھا۔ اس سے بھی بھارتی انتظامیہ کی آمرانہ پالیسی کے باعث ریاست کا زیر تسلط حصہ، مستفید نہ ہو سکا۔ نہ صرف یہ کہ اس طرح کی دستاویز میں تحدید تھی بلکہ دستاویز "د" میں دیے گئے اختیارات کو ۲۷ دسمبر ۴۷ کے لارڈ مونٹ بیٹن کے مہاراجہ کے نام خط سے مشروط ہونا چاہیے تھا۔ بحیثیت گورنر جنرل بھارت لارڈ مونٹ بیٹن نے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر صرف اسی صورت میں مستقل طور پر بھارت میں ضم ہو سکتی ہے جب عوام کی طرف سے کسی قسم کی رضامندی حاصل ہو جائے۔ یہ طریق کار جلد ہی اقوام متحدہ نے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ استصواب رائے کی صورت میں متعین کر دیا تھا لیکن بھارت نے اس طرح کا عوامی فیصلہ کبھی بھی نہیں ہونے دیا۔

مہاراجہ جموں و کشمیر نے اس طرح کی کسی دستاویز الحاق پر دستخط کیوں ثبت نہیں کیے تھے؟ اس کا

جواب اگست ' ستمبر اور اکتوبر ۷ ۴ کے ان تہ در تہ واقعات میں مضمر ہے جن سے ۲۷ اکتوبر ۷ ۴ کا کشمیر کا بحران پیدا ہوا۔ مہاراجہ نے جس کو روز افزوں بد امنی کا سامنا تھا (جس میں ریاست کے علاقہ پونچھ کی پوری آبادی کی طرف سے بغاوت کا مسئلہ شامل تھا) بھارت سے فوجی امداد اس امید پر طلب کی کہ اگر کسی طرح ممکن ہو تو اس کی خود مختاری متاثر نہ ہو۔ حکومت ہند نے یہ مدد دینے میں اس امید پر تاخیر کی کہ قبل اس کے کہ بھارت کوئی قدم اٹھائے ' راجہ مایوس ہو کر بھارت سے الحاق کر دے۔ حالات ایسے تھے بھارت کو بر سر موقع پہلے قدم اٹھانا پڑا۔ مہاراجہ جو کچھ چاہتا تھا یعنی بغاوت کو دبانے کے لیے بھارتی فوجی امداد ' وہ اس کو حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ قدرتی طور پر اس بات کا خواہاں تھا کہ کسی دستاویز پر دستخط ثبت کرنے کے باعث وہ اپنی خود مختاری کو داؤ پر لگانے کے خطرے سے بچ جائے۔ اس پر دستخط کرنے سے وہ امکانی حد تک بچنا چاہتا تھا۔

۲۷ اکتوبر ۷ ۴ کی سہ پہر کے بعد آگے حکومت ہند اور مہاراجہ جموں و کشمیر کے درمیان کسی معاملے کے لیے کارروائی کا جہاں تک تعلق ہے اس کی تفصیلات پر سیاہ دھوئیں کی پرچھائیں پڑی ہوئی ہیں۔

۱۹۴۸ کے قرطاس ابیض کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مارچ ۴۸ تک کسی دستاویز الحاق پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت بھارت اقوام متحدہ میں اپنے دعوے کی تائید میں کشمیر پر اپنا کیس پیش کر رہا تھا۔

دستاویز (الف) اور (ج) کی ثابت شدہ جھوٹی تاریخیں ۲۷ اکتوبر ۷ ۴ کو جموں و کشمیر پر بھارت کی کھلم کھلا مداخلت کی اصل حقیقت کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ بھارت اپنے علاقے کا دفاع نہیں کر رہا تھا بلکہ ایک غیر ملک میں مداخلت بے جا کر رہا تھا۔ اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اگر پاکستان ریکارڈ کی اس جعل سازی سے پہلے دن سے ہی باخبر ہوتا تو بین الاقوامی فورموں پر وہ اس تنازع کے بارے میں ابتدا ہی سے بالکل مختلف طریق پر اپنے موقف کو پیش کرتا اور اگر اقوام متحدہ واقعات کی اصل ترتیب کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیتی تو بھارت کے دلائل کو لائق توجہ نہ سمجھتی۔ متذکرہ حقائق کی روشنی میں ایک غیر جانبدارانہ بین الاقوامی ٹریبونل کو یہ فیصلہ دے دینا چاہیے کہ جموں و کشمیر میں بھارت کے کسی استحقاق کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ماخوز از: India's Commitment To Kashmir Published By Dharendra Sharma New Dehli

---

ڈاکٹر سعید رمضان

حافظ محمد ادریس

اخوان المسلمون کے ممتاز راہ نما اور دورِ جدید میں دین حق کے بے باک اور حکیم ترجمان ڈاکٹر سعید رمضان ۴ اگست 1995 کو جنیوا میں ۶۹ سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ سعید رمضان اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انھوں نے مشکلات و مصائب کا طویل دور گزارا مگر ثابت قدمی سے اپنے راستے پر چلتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسانیاں پیدا کیں تو بھی وہ سخت کوشی سے تحریک اسلامی کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے۔

مصر کے مردم خیز شہر طنطا میں ڈاکٹر سعید رمضان ایک متوسط گھرانے میں ۱۹۲۶ میں پیدا ہوئے۔ سعید رمضان بلا کے ذہین، محنتی اور سنجیدہ نوجوان تھے۔ انھوں نے ۱۴ سال کی عمر میں امام حسن البنا کی تقریر سنی اور ثانوی اسکول ہی میں اخوان کی دعوت سے متاثر ہوئے اور طلبہ کے درمیان اخوان کی علامت اور پہچان بن گئے۔

سعید رمضان نے ۲۰ سال کی عمر میں قاہرہ یونی ورسٹی سے قانون میں ڈگری حاصل کی۔ اس وقت تک طنطا کا یہ عظیم فرزند قاہرہ کے علمی حلقوں میں معروف ہو چکا تھا اور ہر شخص اسے عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ امام حسن البنا کی دُور رس نگاہوں سے ایسا نوجوان بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ انھوں نے انھیں اپنا پرسنل سیکریٹری بنایا اور خصوصی توجہ سے ایسا چمکایا کہ وہ پوری دنیا کو آخری دم تک دین و علم کی روشنی سے منور کرتا رہا۔ سعید رمضان اخوان میں شامل ہوئے تو جلد ہی قائدین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ مرشد عام کے معتمدین خاص میں وہ عمر کے لحاظ سے بہت چھوٹے تھے مگر علم، اصابت رائے اور وسعت نظر کی وجہ سے بڑے بھی ان کی قدر کرتے تھے۔ اخوان المسلمون کے قیام کے وقت ہی امام حسن البنا نے شعبہ امور خارجہ قائم کر دیا تھا جس کا مقصد مصر سے باہر عرب اور اسلامی ممالک میں اخوان کا تعارف کرانا اور دیگر خطوں کی اسلامی تحریکوں سے ربط و تعلق قائم کرنا تھا۔

سعید رمضان نے امام کے نمایندے اور اخوان کے سفیر کے طور پر دیگر ممالک کے علاوہ برصغیر کا بھی سفر کیا۔ انھوں نے برصغیر اور مشرق بعید کے متعدد دورے کیے اور اپنے دوروں کے تاثرات ہفتہ وار "الشھاب" اور "المسلمون" میں تحریر کیے۔

۱۹۴۸ء میں سعید رمضان اخوان نوجوانوں کے ساتھ فلسطین میں جہاد کے لیے گئے۔ ان کے ایک بروقت فون پر شاہ عبداللہ نے اردنی فوج بھیجی اور اس وقت بیت المقدس دہشت گردوں سے محفوظ رہا۔ ۱۹۴۸ء میں ہی انھوں نے کراچی میں موتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کی۔ وہ بعد میں کراچی میں ٹھہر گئے۔ ریڈیو پاکستان کے عربی پروگرام میں تقاریر کیں۔ ان کی ایک کتاب پر لیاقت علی خان نے مقدمہ لکھا۔ انھوں نے پاکستان کے ثقافتی سفیر کی حیثیت سے عرب ممالک کا دورہ کیا۔ وہ نہایت فخر سے جناح کیپ پہنتے تھے اور خود کو پاکستانی کہتے تھے۔ انھوں نے آخری سفر پاکستانی پاسپورٹ پر کیا۔

سعید رمضان شعلہ نوا خطیب کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ادیب اور صحافی بھی تھے۔ الشھاب اور المسلمون ان کے صحافتی کارناموں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ المسلمون بہت موثر آواز رکھتا تھا۔ اس میں مصر کے چوٹی کے ادیب اور علما کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ جمال عبدالناصر کے دور میں اخوان المسلمون پر پابندی لگا دی گئی اور ایک طویل ابتلا کا آغاز ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں فوجی حکومت نے ڈاکٹر سعید رمضان کو گرفتار کر لیا۔ جنرل نجیب کی مداخلت پر رہائی کے بعد تحریکی مفاد اور مصالح کی خاطر وہ بیرون ملک چلے گئے۔ جلاوطنی کے دور میں مرحوم بیت المقدس، شام، لبنان اور اردن میں قیام پذیر رہے۔ ۱۹۵۶ء میں دمشق سے المسلمون کا اجرا کیا۔ اردن کے بعد وہ پاکستان اور سعودی عرب میں بھی کچھ عرصہ رہے۔ زندگی بھر وہ پاکستان اور کشمیر کے مخلص سفیر کے طور پر ہر عالمی کانفرنس میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی پرزور حمایت کرتے رہے۔ انھیں مسلمانوں کے مسائل سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ موتمر عالم اسلامی کا احیا ہوا تو ڈاکٹر سعید رمضان مرحوم کافی عرصے تک اس کے جنرل سیکریٹری رہے۔ بالآخر اگست ۱۹۵۸ء سے سوئٹزرلینڈ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یورپ میں ابتدائی مراکز اسلامی میں سے ڈاکٹر سعید رمضان کا مرکز اسلامی سوئٹزرلینڈ (قیام: ۱۹۶۱) بہت نمایاں اور مفید ادارہ ثابت ہوا۔ ان کے پیش نظر یورپ میں اسلامی مراکز کا ایک سلسلہ تھا۔ میونخ اور لندن میں بھی مراکز قائم کیے۔ انھوں نے دیگر مراکز سے رابطہ قائم کرنے اور اجتماعی ملی مسائل پر یکساں نقطہ نظر کی تشکیل میں ہمیشہ قائدانہ کردار ادا کیا۔ انھوں نے بے شمار عالمی کانفرنسوں میں شرکت کی اور قابل قدر مقالات پیش کیے۔ وہ متعدد کتب کے مصنف بھی تھے۔ جنیوا میں انھوں نے اپنی کتاب Islamic Law Its Scope and Equity شائع کی جسے اے کے بروہی نے "ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے اہم کتاب" قرار دیا۔

ایک طویل عرصہ تک ' جب اخوان کی ساری اعلیٰ قیادت جیلوں میں بند تھی ' اخوان کے ترجمان وہی تھے ۔ اس عرصے میں تحریکی جدوجہد اور ذاتی مسائل کے باوجود جناب سعید رمضان نے مغربی جرمنی سے قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ عالم اسلام کا شاید ہی کوئی ملک ہو گا جہاں وہ نہ گئے ہوں ۔ صدر انوار السادات کے دور میں جب اخوان پر سے سختیاں کچھ کم ہوئیں تو ایک طویل جلاوطنی کے بعد وہ اپنے وطن واپس تشریف لے گئے ۔ مصری اخوان کی خواہش کے باوجود انھوں نے مرکز الاسلامی جنیوا اور یورپ میں اپنے وسیع منصوبوں کی خاطر مصر واپس آنے کی بجائے سوئٹزرلینڈ میں قیام کو ترجیح دی ۔

جمال عبدالناصر نے سعید رمضان کو غیر پسندیدہ شخص قرار دے کر مصر میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا مگر وفات کے بعد جب ان کا جسد خاکی قاہرہ پہنچا تو لوگوں کا بے پناہ ہجوم ان کے استقبال کے لیے موجود تھا ۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور ہر زبان پر سعید رمضان کے لیے داد و تحسین کے الفاظ اور مغفرت کی دعا تھی ۔ سعید رمضان کو قاہرہ میں بساتین کے قبرستان میں امام حسن البنا شہید کے پہلو میں دفن کر دیا گیا ۔ اس موقع پر اخوان کے مرشد عام اور دیگر قائدین نے کہا کہ سعید رمضان کی وفات سے اخوان اور عالمی اسلامی تحریکیں ایک قابل ' محنتی اور مخلص ' ہمدرد بھائی سے محروم ہو گئی ہیں ۔ ان کا خلا پر کرنا کسی دوسرے فرد کے لیے ممکن نہیں ہے ۔

ڈاکٹر سعید رمضان کی اہلیہ وفا جو امام حسن البنا شہید کی بڑی بیٹی ہیں بہت عظیم خاتون ہیں ۔ اپنے والد کی شہادت کے وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی ۔ انھوں نے اس وقت جس عزیمت کا مظاہرہ کیا تھا وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا ۔ ڈاکٹر مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے جہاں بہت اعلیٰ کردار اور اعلیٰ حسب و نسب کی بیوی عطا فرمائی وہیں نہایت قابل ' ذہین اور فرماں بردار اولاد بھی بخشی جو دین و دنیا کے ہر میدان میں اعلیٰ کارکردگی کے باعث والدین کے لیے سرمایہ افتخار ہے ۔ ان کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے ۔ سب سے بڑے صاحبزادے ایمن ' میڈیکل میں ڈاکٹر ہیں اور سوئٹزرلینڈ میں اعلیٰ ترین نیورو سرجن ہیں ۔ دوسرے نمبر پر ڈاکٹر ہانی ہیں جو بلند پایہ محقق اور فلسفے میں پی ایچ ڈی ہیں ۔ جامعہ ازہر میں پروفیسر ہیں ۔ وہ اخوان کے ممتاز مفکرین میں شمار ہوتے ہیں ۔ تیسرے نمبر پر طارق ہیں جو بنیادی طور پر صحافی ہیں ۔ سوئٹزرلینڈ میں مقیم ہیں اور وہاں کی مقامی صحافت میں معتبر نام رکھتے ہیں ۔ وہ پی ایچ ڈی بھی کر رہے ہیں ۔ بلال اور یاسر بھی تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور بیٹی اروی بھی خواتین میں اسلامی دعوت و تبلیغ کا بہترین تجربہ رکھتی ہیں ۔

اللہ تعالیٰ سعید رمضان مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل سے نوازے ۔

پانچ رہائشی منصوبوں کی شاندار کامیابی کی حامل
اور آپ کے کامل اعتماد کی مظہر

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کے نئے رہائشی منصوبے



شاداب کالونی

فیروزپور روڈ لاہور

- جنرل ہسپتال سے تین کلومیٹر کے فاصلہ پر نشتر کالونی کے سامنے فیروزپور روڈ سے چار سو گز دائیں طرف ایک عظیم رہائشی منصوبہ ایل ڈی اے سے منظور شدہ۔ پلاٹ ایک کنال ۱۰ مرلہ ۵ مرلہ۔
- کشادہ سڑکیں، خوبصورت پارکیں، مسجد، ڈسپنسری، سکول، مارکیٹیں، ٹیلیفون اور سوئی گیس کی سہولتیں موجود۔ سکول کالج اور بڑے ہسپتال قریب تر۔ ترقیاتی کام جاری ہیں۔
- پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر بکنگ جاری ہے۔ یکمشت ادائیگی پر ۵ فی صد رعایت۔

تین ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے ڈرافٹ بھیج کر بکنگ کرالیں۔ باقی رقم تین سال ۳۶ مہینوں کی آسان قسطوں میں

۳۱ اکتوبر ۹۵ سے پہلے بکنگ کرانے پر قیمت ۲۵ ہزار روپے فی مرلہ نصف ہزار روپے فی مرلہ کے حساب سے ڈرافٹ بھیج کر بکنگ کرالیں۔ باقی رقم تین سال کی قسطوں میں

شاداب کالونی اور گلشن احباب فیز II کے کمرشل پلاٹوں کی بکنگ کا اعلان

شاداب کالونی فیروزپور روڈ کی اسعد گیلانی مارکیٹ اور گلشن احباب فیز II مین مارکیٹ کے کمرشل پلاٹوں کی بکنگ کا اعلان ہو گیا ہے۔ چند پلاٹ باقی ہیں۔

پہلے آیئے پہلے پایئے

تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ

احباب ہاؤسنگ سوسائٹی (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بٹ ہاؤس 1 اے فنیش روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور

فون: 5869549-5865371
فیکس: 5837016

رسائل و مسائل

اجتہاد و قیاس

ترجمان القرآن میں بعض دفعہ ایسی چیزیں آجاتی ہیں جن کی بنا بر قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہوتی' صرف اجتہاد اور قیاس ہوتا ہے۔ دو ایک چیزیں میں بطور مثال لکھ رہا ہوں: کسی صاحب نے اعضا وغیرہ کا عطیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیشاب اور خون سے قرآنی آیات لکھی جا سکتی ہیں (مارچ ۹۵)۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا عبدالمالک صاحب نے بریلویوں کے پیچھے نماز پڑھنے والے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ میرولی الدین صاحب نے لکھا ہے جب کوئی روضہ رسول ؐ پر حاضر ہوتا ہے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو' اس کے آنے کھڑے ہونے اور زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے (اپریل ۹۵)۔ حالانکہ یہ عقیدہ کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔

۱۔ قرآن و حدیث کے معنی اور مفہوم سمجھنے' ان سے اپنے مسائل کے لیے احکام نکالنے کا نام ہی اجتہاد اور قیاس ہے۔ اگر یہ اجتہاد اور قیاس' قرآن و سنت کے اصولوں کے مطابق ہی ہو' تو یہ بھی دین کا ایک ماخذ ہے اور اس کی یہ حیثیت تمام ائمہ اور علما نے تسلیم کی ہے بشمول امام احمد بن حنبل' امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کے۔ قیاس و اجتہاد تو ہر عالم کرتا ہے' اس سے پرہیز کیا جائے تو سارے دینی علوم دریا میں غرق کر دینا ہوں گے۔

ترجمان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ لیکن قرآن و سنت کا مطلب کیا ہے' منشائے الٰہی کیا ہے' اس کو سمجھنے میں علما کے درمیان حضور ؐ کے زمانے سے اختلاف چلا آرہا ہے۔

۲۔ قرآن میں خود لکھا ہے کہ مضطر کے لیے سور کا گوشت' مردار' اور خون جیسی حرام چیزیں کھانے کی اجازت ہے۔ آدمی مجبور ہو تو کلمہ کفر بھی کہنا جائز ہے۔ اگر قرآن کی یہ باتیں قرآن کے خلاف نہیں تو اعضا کے سلسلے میں جن عالم نے وہ بات کہی جو آپ نے لکھی ہے وہ کیسے خلاف قرآن ہو سکتی

ہے۔ہاں، یہ حق کسی عالم کو پہنچتا ہے کہ کہے کہ یہ رائے غلط ہے۔

۳۔علما نے لکھا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے پیچھے پڑھ لینی چاہیے۔اگر بدعت اور گناہ پر امام کو ہٹانا شروع کر دیں گے تو کوئی باقی نہ بچے گا۔اتباع سنت پر کسی فرقے کا اجارہ نہیں ہے۔کوئی کسی کے نزدیک بدعتی ہے تو کوئی کسی کے نزدیک مشرک۔

۴۔یہ حدیث سے ثابت ہے کہ جب آدمی حضور ؐ کی قبر پر آتا ہے تو حضور ؐ کو اس کا علم ہوتا ہے کیونکہ اللہ کی طرف سے، دیا جاتا ہے، اور اس کا سلام حضور ؐ تک پہنچتا ہے۔

میرے جیسے لوگ، جن کے پاس علم کم ہے، ان کو ان بحثوں اور مسائل میں الجھنا ہی نہیں چاہیے۔کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق نہیں کرنا چاہیے۔ہر مسجد میں نماز پڑھ لینا چاہیے، اور خود اس چیز پر عمل کرنا چاہیے جو ایسا عالم بتائے جس پر انھیں اعتماد ہو۔ (خرم مراد)

حنفی نماز

ہمارے گاؤں کے تمام افراد حنفی نماز ادا کرتے ہیں۔ایک اہل حدیث ہیں، ان کا کہنا ہے کہ حنفی نماز بالکل غلط ہے۔مثلاً حدیث ہے کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے چاہییں اور رفع یدین کرنا چاہیے جب کہ حنفی نہیں کرتے۔جب بھی ہم جماعت کی دعوت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ کی تو نماز ہی صحیح نہیں۔اگر حنفی نماز صحیح ہے تو قرآن و حدیث سے سند تحریر کریں۔ہاتھ باندھنے، رفع یدین کے بغیر نماز اور آمین سری کے متعلق احادیث مع حوالہ لکھیں تاکہ انھیں مطمئن کیا جاسکے۔

امتِ مسلمہ کی اکثریت نماز پڑھنے میں اس طریقے کی پیروی کرتی ہے جو امام ابوؒ حنیفہ اور ان کے متبعین نے طریق محمدی کی روایات سے مستنبط کیا ہے۔اسی طرح دوسرے اماموں نے جو طریقے مستنبط کیے ہیں وہ بھی طریق محمدی کی روایات سے کیے ہیں۔ان کے درمیان معمولی سے اختلافات ہیں، مثلاً: مالکی اور جعفری ہاتھ چھوڑ کر پڑھتے ہیں۔حنفی اور مالکی ایک دفعہ رفع یدین کرتے ہیں، کچھ اور مالکی اور دیگر لوگ، کوئی دو دفعہ، کوئی تین دفعہ، کوئی چار دفعہ رفع یدین کرتے ہیں۔اہل حدیث سینے پر ہاتھ باندھتے ہیں (بروایت بخاری)، حنفی ناف پر (بروایت ترمذی)

بخاری کی کتاب تو رسول اللہ ؐ کے دو سو سال بعد مرتب ہوئی، نماز پہلے دن سے پڑھی جارہی ہے۔ایک دن بھی، ان دو سو سالوں میں ایسا نہیں گزرا جب مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں نماز نہ پڑھ رہے ہوں اور سب کے طریقوں میں اختلاف تھا، اس لیے کہ روایات میں اختلاف تھا۔روایات میں اس لیے اختلاف تھا کہ صحابہ کرام ؓ نے رسول اللہ ؐ کو انھی مختلف طریقوں پر عمل کرتے دیکھا جو

انھوں نے آگے تعلیم دیے۔

حنفی نماز کی اصطلاح ہی غلط ہے ' آپ اسے کیوں قبول کرتے ہیں۔ پھر تو کوئی مالکی نماز ہوگی 'کوئی شافعی 'کوئی حنبلی 'کوئی بخاری۔ نماز ایک ہی ہے 'طریقوں میں معمولی اختلافات ہیں۔

جب کوئی آپ کو طعنہ دے کہ آپ کی نماز صحیح نہیں ' آپ اس تلاش میں لگ جائیں کہ ایک ایک چیز کے لیے آپ احادیث اور روایات جمع کریں تو اس سے زیادہ فضول اور لاحاصل مشغلہ کیا ہو سکتا ہے۔ قرآن و حدیث سے استنباط کا علم ' آپ کے معترضین کے پاس ہے نہ آپ کے۔ ۱۴ سو سال سے اگر امت ایک طریقے پر متفق نہیں ہو سکی تو اب کیسے ہوگی۔ عہد نبوی سے یہی طریقہ چلا آرہا ہے کہ سب اپنے علم و فہم کے مطابق عمل کرتے ' دوسرے کو غلط نہ کہتے۔ اس سے زیادہ کبر کیا ہو سکتا ہے کہ کہا جائے: آدھی سے زیادہ امت کی ۱۴ سو سال سے نمازیں ہی نہیں ہوئیں۔ ویسے علمائے احناف نے حنفی طریقے کے حق میں ساری احادیث جمع کر دی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں آپ کو اس قضیے سے بچنا چاہیے۔ (خ - م)

توحید اور اصلاح عقائد

ایک خالص دینی جماعت کا اولین اور بنیادی کام شرک و بدعت کے خلاف دائمی طور پر سرگرم اور متحرک ہونا ہے یعنی اصلاح عقائد اس کا اولین فرض ہے اور اس کے بغیر کسی تنظیم کو دینی جماعت کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا مودودی مرحوم نے توحید کو اچھی طرح سمجھا اور سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن مشرکانہ عقائد کے خلاف سرگرم جدوجہد کی راہ ترک کر دی یہاں تک کہ مشرکانہ عقائد کے علم بردار لیڈروں کے پیچھے نماز ادا کرنے کو درست کہا اور حکمت تبلیغ اور تفرقہ بازی سے اجتناب کے نام پر تبلیغ توحید کا کام بند کرا دیا۔ جماعت اسلامی کو چاہیے کہ اصلاح عقائد پر بھرپور توجہ دے۔ موحد بن کر ہی کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مسلمان امت میں ایک دینی جماعت کا سب سے مقدم اور بنیادی کام اسلام سے وابستگی کا احیا ' تذکار نعمت ہدایت (اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ) ' اللہ کے ساتھ ایفائے عہد کی دعوت (اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ) ' خشیت و خوف الٰہی کی دعوت (اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ اور اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ) ' قول و فعل کے تضاد سے بچنے کی نصیحت ' اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی سعی ' اور صبر و صلوٰۃ کی تلقین اور آخرت کی تیاری کی تذکیر ہے۔ اس میں جہاں 'جس حد تک ضروری ہو عقائد کی اصلاح بھی۔ جو پہلے سے مسلمان ہوں ' اور توحید کے مدعی ' ان کی اصلاح کے لیے سارا اور مقدم زور صرف شرک و بدعت کے خلاف لگانا دعوت

کی قرآنی حکمت اور اسلوب کے مطابق نہیں۔ اسلام سے وابستگی اور احساس نعمت ہدایت کے سہارے ہی عقائد کی اصلاح ہونا چاہیے اور ممکن ہے۔ بصورت مناظرہ بازی اور تکفیر و تضلیل و تفسیق کے لاحاصل کام میں امت پارا پارا ہو جائے گی۔ حاصل کچھ نہ ہو گا۔

"جو ہمارے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ ہم میں سے ہے"۔ اس اصول کو ملحوظ رکھ کر امت مسلمہ کی اصلاح و احیا کا کام ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی کہانی قرآن میں پڑھ لیجیے، تمام اصول و رموز آپ پر آشکار ہو جائیں گے۔

جماعت اسلامی اس راہ پر گامزن ہے۔ اس سے عقیدہ توحید کی صحت، اور شرک و بدعت کے استیصال کی راہ بنے گی۔ (خ۔م)

قطع رحمی کی گنجائش

ونخلع ونترک من یفجرک کی عملی تشریح ایک صاحب نے یہ کیا ہے۔ اسلام میں قطع رحمی کی گنجائش کن حالات میں ہے؟

نخلع ونترک ایک دعا ہے، اس کے عملی انطباق کی تفصیلات قرآن و سنت کی نصوص اور نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے عمل سے متعین ہوں گی۔

فاسق و فاجر مسلمان تو پھر مسلمان ہے، کافر و مشرک لوگوں سے تعلقات کے بارے میں بھی قطع رحمی اور ترک تعلق کی ہدایت نہیں کی گئی۔ قطع رحمی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ قرآن مجید نے يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ اور يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ کو دو بالکل بنیادی متضاد صفات کے طور پر بیان کیا ہے جو جنت یا دوزخ کا مستحق بناتی ہیں۔ کافر و مشرک والدین اگر شرک پر زور دیں تو صرف اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کرنے کا حکم ہے، اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں معروف کے مطابق حسن سلوک کرنے کا حکم ہے (سورۃ لقمان)۔ مکہ میں ہجر جمیل کی ہدایت کی گئی، یعنی خوبصورتی سے، بغیر کسی بدنما صورت کے، الگ رہو۔ یعنی دل کا تعلق نہ رکھو۔ سورۃ ممتحنہ کی آیت واضح ہے، جن لوگوں نے گھر بدر نہیں کیا، قتال نہیں کیا، ان کے ساتھ بر (نیکی اور وفا) اور قسط کا برتاؤ کرو۔

مسلمان فاسق و فاجر ہو تو بھی مسلمان ہے۔ کافر کے بارے میں جو احکامات ہیں، مسلمان کم سے کم ان کا وہ بدرجہ اتم مستحق ہے۔ لیکن مسلمان سے کینہ نہ رکھنا، مسلمان سے تین دن سے زیادہ بول چال ترک نہ کرنا، (اور یہ نہیں بیان کیا کہ یہ لازماً صالح اور متقی مسلمان ہو) اس کی حمایت و نصرت کرنا، اس کی ستر پوشی کرنا ___ یہ سب قرآن و سنت کے احکام ہیں۔ (خ۔م)

وسوسوں سے چھٹکارا

میں ایک وسوسوں کا مارا ہوا انسان ہوں' جس خیال کو میں برا سمجھ کر رد کرتا ہوں' وہ بار بار آ جاتا ہے۔ کبھی نہایت مختصر عرصے کے لیے دل کو ایمان سے لبریز پاتا ہوں لیکن پھر وہی حالت ہو جاتی ہے۔ پریشان ہوں' کہیں میرے دل پر مہر تو نہیں لگا دی گئی۔ دوستوں کو دیکھتا ہوں کہ کتنے اطمینان سے ہیں تو دل مزید بجھ سا جاتا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ وسوسوں پر پکڑ نہیں' یہ ایمان کی نشانی ہیں۔ ان کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے۔ میرے بارے میں قرآن و سنت کا کیا حکم ہے۔ کیا میں کبھی ان وسوسوں سے چھٹکارا پا سکوں گا؟

آپ کو ہر بات کا علم ہے' اور صحیح علم ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ وسوسے ایمان کی نشانی ہیں۔ وسوسوں پر آپ کو پریشانی اور اضطراب ہے' یہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ چیز ہے۔ وسوسوں سے چھٹکارا یا نجات ممکن نہیں۔ ایک ہی اختیار تو اللہ تعالٰی نے شیطان کو دیا ہے۔ عمل پر کوئی آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ سوال کہ کیا مجھے کبھی چھٹکارا ملے گا' لایعنی سوال ہے۔ جواب ہے کہ 'نہیں۔

ہر چیز کی ایک غذا ہوتی ہے جس سے وہ قوی ہوتی ہے اور اس کی نشوونما ہوتی ہے' جس طرح انسان کی کھانے پینے سے' درخت کی پانی کھاد سے۔ وسوسوں کی غذا ہے توجہ اور اس کی پروا اور اس کے بارے میں سوچنا۔ آپ کوئی توجہ نہ کریں' لاپروا ہو جائیں' ان کے بارے میں نہ سوچیں' وہ خود اپنی موت مر جائیں گے۔ جتنا آپ نکالنے کی کوشش کریں گے وہ قوی ہوں گے۔ اس لیے کہ آپ کی توجہ اس پر ہو گی۔ اس لیے علاج یہ ہے کہ آپ بالکل کوئی دوسری چیز سوچنا شروع کر دیں۔ توجہ خود بخود ہٹ جائے گی۔ وسوسہ مر جائے گا یا اس وقت کے لیے فرار ہو جائے گا۔

اللہ کو یاد کریں' اعوذ باللہ پڑھیں' اس کے احسانات اور اس سے ملاقات کو یاد کرنا شروع کر دیں' اپنے کو کسی کام میں لگا دیں۔ بے فکر ہو کر عمل کرتے رہیں۔ اللہ بھلا کرے گا۔ (خ۔ م)

کہاں کا قصد کیا ۔۔۔ چل پڑے کہاں کے لیے

۱۔ آپ کے خیال میں قیام پاکستان کے کیا مقاصد تھے؟

۲۔ کیا آج کا پاکستان اقبال کے خواب کی تعبیر ہے؟

۳۔ موجودہ حالات کے تناظر میں' پاکستان کے مستقبل کے بارے میں آپ کیا پیش گوئی کر سکتے ہیں؟ مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے کیا تدابیر ہو سکتی ہیں؟

۱۔ قیام پاکستان کا مقصد یہ تھا کہ ہندو پاکستان کے سارے کے سارے مسلمان ایک اقلیت کی

حیثیت سے اکثریت کے عددی تہذیبی ' سیاسی اور معاشی غلبے کے تسلط سے بچ سکیں ۔ بعض علاقوں میں وہ اکثریت میں ہیں ۔ اکثریت کے علاقے میں ان کی آزاد و خود مختار حکومت قائم ہو اور وہاں وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر قرآن و سنت کی تعلیمات و احکامات کے مطابق کر سکیں ۔

۲۔ آج کا پاکستان اکثریت کے غلبے سے نجات کی حد تک ' اور دستوری و قانونی اور رسمی طور پر اجتماعی زندگی کی تشکیل کی حد تک درج بالا مقاصد کا آئینہ دار ہے ۔ اکثریت کے تہذیبی ' سیاسی اور معاشی غلبے سے نجات مل گئی اور معاشی و تعلیمی لحاظ سے وہ حاصل ہو گیا جو ایک اقلیت کے طور پر حاصل ہو سکتا تھا ۔ دستور بھی اسلام کے مطابق بن گیا اور ریاست کی حیثیت اور سمت بھی اسلامی متعین ہو گئی ۔

لیکن جہاں تک حقیقتاً ایک مسلمان معاشرہ بننے اور اچھے انسان اور مسلمان بننے کے خواب کا تعلق ہے ' تو موجودہ پاکستان کسی طرح بھی ہمارے خوابوں کی تعبیر نہیں ۔

۳۔ مستقبل کا انحصار تو قوم پر ہے ۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے ۔ بعض قومیں فساد و طغیانی کا شکار ہو کر ' مقصد و مدعا سے محروم ہو کر بنی اسرائیل کی طرح ذلت و مسکنت کا شکار ہو جاتی ہیں ۔ اس وقت جو رنگ ڈھنگ ہیں ان کے پیش نظر یہ مستقبل بھی بالکل بعید از قیاس نہیں ۔ لیکن بعض دفعہ صحرانوردی کے بعد ایک نئی نسل اٹھتی ہے اور ارض موعودہ حاصل کر لیتی ہے ۔ بعض قومیں ' قوم یونس کی طرح ' عین ہلاکت سر پر پہنچنے کے بعد اپنا قبلہ اور سمت درست کر لیتی ہیں اور ہلاکت سے نجات پا جاتی ہیں ۔ قوموں کا معاملہ بھی افراد کی طرح گردش روزگار کی طرح کسی جبریت کا شکار نہیں ۔ اس لیے اس کے مستقبل کی پیشن گوئی ممکن نہیں ۔

مستقبل کی تابناکی کا تو ایک ہی نسخہ ہے: ایمان ' تقویٰ ' استغفار ۔

(اسلامی جمعیت طالبات کے رسالے پکار کے ایک سروے کے جواب میں (خ ۔ م) ۔

کتاب نما

بوسنیا: منتخب انگریزی کتابیات

خرم مراد

بلقان کے بارے میں کتابوں کی کمی نہیں‘ لیکن ۱۹۹۲ء کے بعد سے ‘ جب مغربی طاقتوں کی جانب سے بوسنیا کے مسلمانوں کی نسل کشی شروع ہوئی‘ اس موضوع پر انگریزی میں بے شمار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ مطالعہ کے خواہاں قارئین کی راہ نمائی کے لیے ‘ان میں سے چند کتابوں کا مختصر تعارف ‘ یا ان کی اشاعتی تفصیلات ہم ذیل میں دے رہے ہیں۔ یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ یہ کتابیں ‘ اسلامی نہیں ‘سیکولر لبرل نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ لیکن بالعموم حق و انصاف پر مبنی ہیں۔ (مدیر)

۱- Why Bosnia? ed. by Rabia Ali and Lawrence lif Schultz, Pamphleteers Press, 1993.

مطالعہ شروع کرنے کے لیے مضامین اور نظموں کے اس مجموعے سے بہتر کتاب مشکل سے ملے گی۔ ربیعہ علی ‘کیمبرج سے پی ایچ ڈی ہیں اور پاکستان پر ریسرچ کر رہی ہیں ‘لف شلز معروف عالمی صحافی ہیں۔ دونوں نے جس گہرائی ‘ وسعت ‘حسن اور محنت کے ساتھ یہ مجموعہ ترتیب دیا ہے وہ قابل داد ہے۔ واقعات ‘ شواہد ‘ استدلال اور جذبات سے بھرپور ‘ یہ تجزیے اور تاثرات ‘بوسنیا کو نیست و نابود کرنے کی مہم کے تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ مغربی طاقتوں کے عزائم اور منافقت ‘ ان کی جانب داری ‘مسلمانوں کی نسل کشی ‘جھوٹے پروپیگنڈوں کی حقیقت ‘صلح کی نام نہاد کوششوں کے پردے میں بوسنیا کو مٹانے کے منصوبے ‘ سب کا تجزیہ ‘سب کی جھلک ‘ سب کی نقاب کشائی یہاں موجود ہے۔ ربیعہ علی اور لف شلز کا اپنا لکھا ہوا ۵۴ صفحات پر مشتمل ابتدائی مقالہ (x تا Livi) خود اپنی جگہ ایک مکمل داستان ہے۔ بوسنیا میں نسل کشی اور تباہی و بربادی پر آل مین (All minn) ‘ ابراہیم کایان اور مارک تھامپسن نے ‘ ثقافتی تباہی کے بارے میں اسماعیل بالک نے ‘صلح جوئی کی کوششوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے تھامس ہیری سن ‘ مارکو پری لیک (Prelec) اور قاسم ترنکا نے عمدہ مضامین لکھے ہیں۔

۲- Bosina: A Short History, by Noel Malcolm, Macmillan, London, 1994.

نوئل میلکم ایک قدامت پسند ٹوری دانش ور ہیں، نسل، قوم، مذہب جیسے تصورات پر یقین رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے جس مہارت اور خوب صورتی کے ساتھ مسلم بوسنیا کی تاریخ کے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مختصر ہی نہیں، انتہائی جامع بھی۔ ان کی رسائی ترک، سرب، کروایٹ، جرمن، فرنچ، تمام زبانوں کی کتابیات تک ہے، اور اپنے ماخذ پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ اس کا مظہر ان کے ۴۴ صفحات پر مشتمل حوالے اور حواشی بھی ہیں، اور آخر میں ۲۰ صفحات پر مشتمل تقریباً ۵۰۰ ماخذ کی کتابیات بھی۔

بوسنیا کا کوئی مطالعہ اس کتاب سے مستغنی ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی طاقتوں نے جس پہلو سے بھی تاریخ کو مسخ کیا، اور جھوٹ کے طومار باندھے، میلکم نے اس کا پول کھول دیا ہے۔

مغرب، کروایٹ اور سرب، صرف مستقبل ہی نہیں مٹا رہے، ماضی بھی مٹا رہے ہیں۔ انسان، عمارتیں، لائبریریاں، سب کے سب۔ ''اس سے پہلے کہ ملک مکمل طور پر تباہ ہو جائے، میں اس کتاب میں اس کی تاریخ محفوظ کر دینا چاہتا ہوں''۔ (ص xxiv)

میلکم، پہلے، ۱۱۸۰ سے شروع کر کے، ۱۴۶۳ تک بوسنیا کی خوش حال طاقت ور ریاست کے احوال بیان کرتے ہیں۔ پھر، خلافت عثمانیہ کے فتح کر لینے کے بعد، بوسنیا میں اسلام کس طرح تیزی سے پھیلا، ۱۸۷۸ تک وہ کس طرح خلافت کے نیم خود مختار صوبہ کی حیثیت سے امن، خوش حالی، ثقافتی ترقی، رواداری کا گہوارہ بنا رہا، ۱۸۷۸ میں آسٹرو۔ ہنگرین کا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد یوگوسلاویہ کا، جزو بن کر بوسنیا پر کیا قیامتیں ٹوٹیں، یہ ساری داستان وہ بڑے محققانہ انداز میں سناتے ہیں۔ آخری دو باب ۱۹۸۹ - ۱۹۹۲ اور ۱۹۹۲ - ۱۹۹۳ بوسنیا کی تباہی کی درد بھری داستان پر مشتمل ہیں۔ میلکم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بوسنیا پر جنگ باہر سے مسلط کی گئی ہے، اندر کوئی ایک بھی عامل ایسا نہیں تھا جو اس جنگ کا باعث بنتا۔

۳- Bosnia and Hercegovina: A Tradition Betrayed, by, Robert J. Donia and John V.A. Fine, Columbia University Press, 1994

دونوں مصنف، مورخ ہیں۔ ڈونیا، ادمہ وسطی سے شروع کر کے عثمانی حکومت کے خاتمے تک کی کہانی سناتے ہیں۔ فائن، آسٹرو ہنگرین قبضے سے شروع کر کے کہانی کو حالیہ جنگ تک پہنچا دیتے

ہیں۔ دونوں اپنے اپنے زمانے کی تاریخ کے ماہر ہیں۔ یہ دونوں بھی ناقابل تردید حقائق کے ساتھ یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ بوسنیا ہمیشہ ایک علیحدہ ملک رہا ہے' اس کی سرحدیں سربیا اور کروشیا کی بہ نسبت زیادہ محفوظ اور مستقل رہی ہیں۔ وہ یہ بھی دکھاتے ہیں کہ بلقان میں خون ریزی ضرور ہوئی ہے' لیکن آج سے پہلے کبھی بوسنیا کے تینوں گروہوں کے درمیان' اور نسلی بنیاد پر' کبھی بھی نہیں ہوئی۔ یہ نہ خانہ جنگی ہے' نہ نسلی جنگ۔ کتاب کا انداز' تحریر آسان اور سلیس ہے' ہائی اسکول کی درسی کتاب کی طرح۔ میلکم کی تاریخ کے بعد' اگر مزید پڑھنا ہو تو یہ کتاب مفید اور دلچسپ ثابت ہوگی۔

د۔ The National Question in Yugoslavia: Origins, History, Politics, by I.Banac. Ithaca, 1984

بلقان کی تاریخ پر مزید تفصیل کے لیے' یہ کتاب ایک مستند ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ھ۔ Slaughterhouse Bosnia and the Failure of the West, by David Rieff, Simon & Schuster, Newyork, 1995

ڈیوڈ رائف ایک صحافی ہیں اور بار بار بوسنیا گئے ہیں۔ وہ پوری بے باکی سے' مغرب کے جرائم کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ ان کی آواز میں حمایت حق کی گھن گرج بھی ہے' مغرب کے خلاف غم و غصہ بھی' یاس و ناامیدی بھی۔ انداز صحافیانہ ہے' لیکن حقائق سے لبریز۔ کتاب مختصر ہے لیکن جامع۔ مغربی طاقتوں کے جرائم کے خلاف اتنی تفصیل سے اور اتنی مضبوط فرد جرم اور کہیں مشکل سے نظر آئے گی۔ دس ابواب پر مشتمل یہ کتاب' جس میں نہ عنوانات ہیں نہ سرخیاں' ایک مسلسل بیان ہے۔ لیکن جو اپنے احساس شرم' اذیت اور غم و غصہ پر قابو پا سکتا ہو' وہ اس کتاب کو ختم کیے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھ سکتا۔

رائف بالکل واضح کر دیتے ہیں' میں مذبح خانے کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ جو کچھ بوسنیا میں ہوا' اسے "جنگ" کہنا صورت حال کو مسخ کرنا ہے۔ یہ ایک آبادی' ایک تہذیب' ۵۰۰ سالہ یورپین اسلام کو ختم کرنے کے نفرت انگیز کام کو عزت بخشنا ہے"۔ جنگ میں' خون ریزی کے باوجود' قوانین ہوتے ہیں' ضابطہ عزت و اخلاق ہوتا ہے "بوسنیا میں کچھ بھی نہیں ہے؟"

رائف تفصیل سے بتاتے ہیں یہ مغرب کا فیصلہ تھا کہ سربیا درندگی کی بدترین کارروائیاں کرے۔ اس کے تعاون کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ سفارت کار پہلے دن سے جانتے تھے کہ ہمیں بوسنیا کو بچانے کے لیے انگلی بھی نہیں ہلانا۔ مغرب کا ایجنڈا صرف اتنا تھا کہ یہ تاثر پیدا ہوتا رہے کہ کچھ کیا جا رہا ہے" [اور آج بھی یہی ہے]۔ ایک یو این کمانڈر نے رائف کو بتایا: "ہمارا مشن یہ تھا کہ کچھ نہ کرو' بس تاثر

دو کہ کچھ کر رہے ہو۔یہ بڑا مشکل مشن تھا"۔[ایک باضمیر انسان کے لیے]

۶۔ A Witness to Genocide by Roy Gutman, Element Books, Longmead, 180 pp. [Macmillan, USA]

گٹ مین بھی ایک صحافی ہیں۔وہ نیوز ڈے' نیویارک کو' ۲۱ نومبر ۱۹۹۱ سے ۲۲ جون ۱۹۹۳ تک بوسنیا میں قتل و غارت 'نسل کشی 'عصمت دری 'گھر بدری' کی رپورٹس بھیج رہے ہیں۔ساتھ ہی انھوں نے مغربی طاقتوں کا چہرہ بے نقاب کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔یہ کتاب انھی رپورٹوں کو جمع کر کے ترتیب دی گئی ہے۔آغاز میں ۳۶ صفحات کے نوٹ اور تعارف میں وہ پوری کہانی کو سمیٹ کر چند لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔

قتل و غارت اور عصمت دری کے یہ مرقعے اتنے دردناک ہیں کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔آخری رپورٹ اقوام متحدہ فوج کے کینیڈین کمانڈر جنرل میکنیزی کے بارے میں ہے۔جنرل صاحب 'ریٹائرمنٹ کے بعد' امریکہ میں سرب لابی 'سرب نیٹ' سے ہر تقریر کے لیے ۱ہزار ڈالر فیس لے کر تقریریں کر رہے ہیں اور امریکن کانگریس کو یہ یقین دلانے میں مصروف کہ اصل قصور مسلمانوں کا ہے' اور مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ان کو بوسنیا کے وسط میں ایک چھوٹی سی محصور ریاست دے کر' باقی ملک سربیا اور کروشیا کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔[سرائیوو کے ارد گرد بم باری اور او آئی سی کے ساتھ میٹنگ کے ذریعے صلح کے معاہدہ کی کوشش کا ہدف بھی یہی ہے]۔

۷۔ War Crimes in Bosina - Hercegovina, Helsinki Watch, New York, 1992

۸۔ Bankrupt in the Balkans: British Policy in Bosnia, by J.M.O. Sharp, London, 1993.

۹۔ Blundering in the Balkans: European Community and the Yugoslav Crisis by Mark Almond, Oxford, 1991.

۱۰۔ A Paper House: The Ending of Yugoslavia, by M. Thompson, London, 1993.

۱۱۔ Europe's Backyard War, by Mark Almond, Heinemann, London.

۱۲۔ Islam in the Balkans: Religion and Society between Islam & Europe, by H.T. Norris, London, 1993.

فی ظلال القرآن ' (جلد اول ' پارہ ۱ تا ۴) سید قطب شہید - مترجم: سید معروف شاہ شیرازی - ناشر: ادارہ منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ لاہور - صفحات: ۹۶۱ - قیمت: ۲۵۰ روپے -

"فی ظلال القرآن" کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے - چار دانگ عالم میں مشہور اور اپنے دور کی بے نظیر علمی ' دعوتی 'تحریکی اور انقلابی تفسیر ہے - قافلہ تجدید و احیاے دین اور کاروان انقلاب و جہاد کے سرخیل و امام سید قطب شہید کے قلم خارا شگاف کا شاہکار ہے -

اس میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور مضامین کو اجاگر کیا گیا ہے - مصنف نے قرآن پاک کی اثر انگیزی 'جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی 'کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے - اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آ پہنچی - آپ ؐ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی - قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے -

سید قطب شہید عربی ادب میں ممتاز مقام رکھتے تھے - ان کی زبان اور قلم میں دریا کی سی روانی اور سمندر کی سی طغیانی ہے - وہ اپنی بلند پایہ خطابت کے ذریعے قرآن پاک کے مضامین کو دل و دماغ میں اس طرح سے جاگزین کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا باطل کے ساتھ ٹکرا جانے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دینے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے -

عرب دنیا میں اس تفسیر نے ایک تہلکہ برپا کر دیا ہے - عجم اس سے فیض حاصل کرنے کے انتظار میں تھا - اس کے اردو ترجمے کی بڑے پیمانے پر طلب اور خواہش تھی - اس کے لیے ایسے مترجم کی ضرورت تھی جو عربی ادب پر گہری دسترس رکھتا ہو اور اردو کے بہترین اسلوب نگارش سے بھی اچھی طرح آشنا ہو - تفسیر و حدیث 'فقہ اسلامی اور دوسرے علوم عربیہ و اسلامیہ پر بھی اس کی نظر ہو - اسلامی تحریک سے بھی گہری اور عملی وابستگی رکھتا ہو - اس کا ایک ترجمہ بھارت کے سید حامد علی مرحوم نے شروع کیا تھا 'مگر وہ ناتمام رہ گیا - (گذشتہ ماہ اس پر تبصرہ آ چکا ہے) پاکستان میں سید معروف شاہ شیرازی نے کافی عرصے قبل اس عظیم الشان تفسیر کے ترجمے کا آغاز کیا تھا - وہ قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہیں - عربی اور اردو ادب سے انھیں زمانہ طالب علمی سے شغف ہے - متعدد جدید تحریکی اور عربی کتب کا ترجمہ کر کے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں - اس طرح سے انھیں ترجمہ کے میدان میں پوری مہارت اور تجربہ حاصل ہو گیا ہے - وہ "فی ظلال القرآن" کا ترجمہ الحمدللہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا

ہے، اور اب اس کی پہلی جلد معیاری کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے زیور سے آراستہ ہوکر سامنے آئی ہے۔

زیرنظر ترجمے میں تلخیص سے کام نہیں لیا گیا بلکہ پوری کتاب کا مکمل ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے عربی ایڈیشن میں پہلی جلد کے صفحات ۶۱۱ ہیں اور ترجمے کی پہلی جلد کے صفحات ۹۶۱ یعنی ۳۵۰ صفحات زیادہ ہیں۔ عربی کو ایسی حسین اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے کہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست کا مصداق ہے۔ روانی اور سلاست ایسی کہ ترجمے کا شبہ نہیں ہوتا۔ ترجمے کے بارے میں مترجم نے بجاطور پر فرمایا کہ "اس کا ترجمہ اس معیار کا تو ممکن ہی نہیں، میں نے اپنے اس ترجمے میں نہایت ہی سہل اور سادہ پیرایہ اظہار میں ان کے مفہوم اور مراد کو منتقل کرنے کی سعی کی ہے"۔ (ص ۸) اس کا صحیح اندازہ تو وہی لوگ کرسکیں گے جو عربی اور اردو دونوں کا تقابلی مطالعہ کریں۔ اصل کتاب کی طرح، ترجمے میں بھی پہلے ایک درس کی آیات دی گئی ہیں اور پھر ان کا سلیس اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ قرآنی آیات جہاں کہیں بھی آئی ہیں انھیں جلی قلم سے الگ لکھا گیا ہے۔ تصحیح کا بطور خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی جہاں بھی آیا ہے وہاں صلی اللہ علیہ وسلم پوری طرح لکھا گیا ہے جو ادب و احترام کا ضروری تقاضا ہے۔ صفحہ ۷۷۷ پر وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ کا ترجمہ صحیح دیا گیا ہے لیکن آیت مذکورہ کی جگہ دوسری آیت: مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ دی گئی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ اگلی اشاعت میں اس کی اصلاح کر دی جائے۔ (عبدالمالک)

ازواج مطہرات اور مستشرقین ظفر علی قریشی، مترجم: پروفیسر [illegible]ی ضیائی۔ پتا: ایس آئی گیلانی بک سیلرز، الرحمن بلڈنگ رنگ لین، ۶۰ دی مال لاہور۔ صفحات: ۶۱۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی کے بارے میں بیشتر مغربی سیرت نگاروں اور مستشرقوں نے بہت چھینٹے اڑائے ہیں۔ بعض کا رویہ تو واضح طور پر سخت معاندانہ رہا ہے۔ یہ رویہ صدیوں سے جاری مسلم صلیبی کشمکش کا ایک حصہ ہے۔ مسلم علما نے سیرت النبی ؐ پر اڑائے جانے والے چھینٹوں اور داغ دھبوں کو دور کرنے میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ زیرنظر مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو جامعہ ازہر قاہرہ کی ایک بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں پیش کیا گیا۔

پروفیسر قریشی نے سیرت النبی ؐ پر مستشرقین کے اعتراضات کے موضوع پر سالہا سال تک تحقیق کی ہے۔ چنانچہ ان کے مطالعے کی وسعت اور موضوع پر مہارت زیرنظر مقالے میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے آنحضرت ؐ کے ایک ایک نکاح کے معاملے پر الگ الگ بحث کی ہے اور مستشرقین

کے جملہ اعتراضات کے شافی جواب دیے ہیں اور بیشتر استشہادات مسیحی مستشرقین ہی سے کیے ہیں جو معترف ہیں کہ ان نکاحوں کے پس منظر میں کسی خواہشِ نفس کا کوئی دخل نہ تھا۔ تعددِ ازواج کی حکمتیں ' تقاضے اور مصلحتیں دیگر تھیں۔

پروفیسر آسی ضیائی نے اس مقالے کو مہارت اور عمدگی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ مقالہ گو مختصر ہے 'مگر مصنف نے دستاویزی شہادتیں اور حوالے فراہم کر کے ' اسے جامع اور مستند بنا دیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک معیاری اور کامیاب تحریر ہے۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

ذہنی اضطراب اور سکون کی راہ : ڈاکٹر علی اصغر چودھری۔ ناشر: اسلامک پبلی کیشنز 'شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ صفحات: ۲۳۲۔ قیمت: ۳۶ روپے۔

یہ کتاب عملی نفسیات کے ایک اہم موضوع پر اسلامی اور مشرقی نقطہ نظر کو موثر اور مفید انداز میں پیش کرتی ہے۔ سکون کے حصول کے لیے کارنیگی بھی مذہب 'بلکہ نام لے کر اسلام کی افادیت کو تسلیم کرتا ہے مگر کارنیگی کے نزدیک یہ محض درجنوں نسخوں میں سے ایک "نسخہ" ہے جسے ایک شخص "بوقت ضرورت" آزما سکتا ہے۔ لیکن کتاب زیر تبصرہ میں ڈاکٹر علی اصغر چودھری ایک مسلمان کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں جس کا بنیادی عقیدہ ہی خالق کائنات کے وجود اور اس کی صفات پر ایمان ہے۔ کائنات کی اس اہم ترین حقیقت کو تسلیم کرنے کا لازمی اثر ایک مسلمان کی زندگی پر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ حقیقی سکون و مسرت کی تلاش میں نہ تو شتر بے مہار بنتا ہے ' نہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا قائل ہو کر ہر نئے فیشن کی اندھا دھند پیروی کرتا ہے ' نہ منشیات کے اندھیروں میں ڈوبتا ہے اور نہ عقل انسانی کے ایجاد کردہ نت نئے اور بدلتے کارنیگی ٹائپ نسخوں پر انحصار کرتا ہے۔

مصنف کے نزدیک حقیقی سکون کا سرچشمہ خدا پر توکل 'اس کی طرف رجوع 'اس کے فیصلوں اور تقدیر پر راضی رہنا اور اپنی زبان (بلکہ ہو سکے تو دل اور اعضا کو بھی) ذکر الٰہی سے تر رکھنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب طائف کے ایک ہسپتال میں بہت سے ایسے دماغی مریضوں کا قرآنی آیات کی تذکیر کے ذریعے کامیاب علاج کر چکے ہیں 'جنھیں دوسرے ڈاکٹر لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ (ص ۱۳)

مصنف نفسیاتی امراض کا حل تجویز کرتے وقت بظاہر مشرقی روایات 'تصوف اور ذکر الٰہی پر کلیتاً انحصار کرتے ہیں۔ یہ واضح نہیں کہ وہ جدید نفسیات کے تجویز کردہ جائز اور مفید نسخوں کا بوقت ضرورت استعمال کرنے کے کس حد تک قائل ہیں؟ یہ کتاب عملی نفسیات کو "اسلامیانے" کی ایک اچھی کوشش بن سکتی ہے بشرطیکہ اس میں مشرقیت پر غیر ضروری انحصار کو ختم کیا جائے۔ مصنف بجا طور پر فرماتے ہیں کہ "اس (مغربی) سائنس نے جب سے طب کے میدان میں دخل دیا ہے ' انسان کو فقط

ایک وجود حیاتیاتی سمجھا ہے اور اس کے نفس و روح کا انکار کیا ہے"۔ مگر وہ اس بات سے کس حد تک اتفاق کریں گے کہ انسانی وجود اور نفسیات کے حیاتیاتی پہلو کو سمجھنے میں جدید سائنس 'طب یونانی سے سیکڑوں برس آگے ہے۔ (ڈاکٹر بلال مسعود)

ڈارون جو ارتقائی نظریو اور اسلام (سندھی): مولانا محمد رمضان پھلپوٹو 'مدرسہ عربیہ مظہر العلوم حماریہ کھڑا' گمبٹ 'ضلع خیرپور' سندھ۔ صفحات: ۱۲۰۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

مصنف 'نوجوان نسل کے ان معدودے چند سندھی ادیبوں میں شامل ہیں جو بیک وقت دینی و دنیوی علوم سے بہرہ ور ہیں۔ وہ مدرس ہیں اور ان کی متعدد پر اثر تحریریں کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف نے گو کہ پرانے موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن انداز تحریر میں جدت اور جدید سائنسی نقطہ نگاہ اپنا کر اسے خاصی حد تک دلچسپ 'مدلل اور معلوماتی بنا ڈالا ہے۔ مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے (مقدمہ) میں تاریخی اعتبار سے ارتقائی نظریے کی تفصیلات اور نقصانات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے یعنی باب اول میں مستشرق علما اور سائنس دانوں کے تجربات کی روشنی میں اصل انگریزی حوالہ جات کی مدد سے ڈارون کے فاسد نظریہ حیات کی بیخ کنی کی گئی ہے اور تیسرے حصے یعنی باب دوم میں قرآن کریم کی تعلیمات اور مسلمان اکابر کے نکتہ نگاہ کو بڑی خوش اسلوبی سے یکجا کر کے ڈارون کے ارتقائی نظریے کو رد کیا گیا ہے۔

مذکورہ کتاب تحریر کے اعتبار سے شگفتہ اور مروج و عام فہم سندھی زبان میں لکھی گئی ہے۔ البتہ عربی عبارات بغیر اعراب کے 'عام قاری کے لیے پڑھنا مشکل ہو گا۔ انگریزی پیراگراف پورے کے پورے نقل کرنے کے بجائے 'بہتر ہوتا کہ پیرے کے شروع اور آخر کے چند الفاظ نقل کر دیے جاتے اور موجودہ ترجمہ برقرار رکھا جاتا۔ اس طرح اوسط خواندہ قاری کا ذہن انگریزی کے دباؤ کا شکار ہونے سے محفوظ رہتا۔

مجموعی طور پر یہ کتاب مسلمانوں کے لیے جہاں جدید معلومات کی زنبیل ہے وہاں حق سبحانہ تعالی کو حقیقی خالق کائنات ماننے والوں کے لیے ایک لائٹ ہاؤس بھی ہے۔ دعا ہے کہ رب ذوالجلال مصنف کی محنت کو شرف قبولیت بخشے۔ (انجینئر عبدالمالک میمن)

مدیر کے نام

ڈاکٹر محمد ذکاء اللہ، اسلام آباد

اشارات "فکر مودودی کیا ہے؟" (ستمبر ۹۵) وقت کی ضرورت ہیں۔ بلاشبہ آپ نے اس موضوع کا حق ادا کیا ہے۔ یہی بات مولانا مودودی کو اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے کہ انھوں نے صدیوں سے بند اجتہاد کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے ہمارے بعض بزرگ اور دوست فکر مودودی کے نام پر ہمیں مولانا مودودی کی اندھی تقلید پر آمادہ کر کے اجتہاد کا دروازہ بند رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں آپ کے اس مضمون کی اہمیت کہیں بڑھ جاتی ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب (احیائے اسلام: چیلنج اور امکانات) نے بہت اچھے انداز سے اپنا موقف پیش کیا ہے۔ مکالمات کا یہ سلسلہ جہاں مغرب کی سعید روحوں کو اسلام کے قریب لائے گا، اس کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے خلاف مغربی قوتوں کی مہم جوئی کو روکنے یا کم از کم اس کی شدت میں کمی کا باعث بھی بنے گا، ان شاء اللہ۔

ڈاکٹر مقبول شاہد، لاہور

"پراویڈنٹ فنڈ کی زائد رقم" (ستمبر ۹۵) کے بارے میں مولانا مودودی کی رائے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جس میں انھوں نے پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والے سود کو سود ہی قرار دیا تھا اور اسے لینے سے منع کیا تھا۔ میں خود اس محفل میں موجود تھا جس میں ایک شخص نے ان سے یہ سوال پوچھا تھا اور مولانا نے فرمایا تھا کہ اگرچہ فنڈ کی رقم ملازم کے قبضے میں نہیں آتی لیکن چونکہ ملکیت اسی کی ہوتی ہے، اس لیے میرا اطمینان اسی پر ہے کہ یہ سود ہے اور حرام ہے۔

سلیم الدین احمد، کراچی

پراویڈنٹ فنڈ اور سود کے بارے میں، میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کے رسالے کے حوالے سے مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب سے استفسار کیا تھا۔ انھوں نے لکھا کہ اگر یہ رقم (جو بنام سود دی جاتی ہے) کمپنی اپنی طرف سے دے، یا سود وصول کر کے دے، لیکن ملازم کو معلوم نہ ہو کہ یہ رقم سود سے حاصل کی گئی ہے، تو ملازم کے لیے اس کا لینا جائز ہے۔ لیکن اگر ملازم کو علم ہو کہ کمپنی نے زائد رقم بطور سود جمع کر کے اس کے

اکاؤنٹ میں جمع کی ہے' تو یہ لینا جائز نہیں۔

عبدالحمید نصر ' گوجرانوالہ

ترجمان القرآن ہر لحاظ سے ایک اعلیٰ معیاری رسالہ ہو گیا ہے۔ فہم قرآن' فہم حدیث' تحریکات اسلامی اور فقہ و اجتہاد کے عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ اس طرح ہر ماہ تاریخ پر بھی ایک مضمون ضرور شائع ہونا چاہیے۔

محمد اسماعیل ' شورکوٹ کینٹ

اشارات ' دینی مدارس ' توہین رسالت جس موضوع پر بھی لکھے گئے حق ادا کر دیا گیا۔ میں تو اس رسالے کو دل دے بیٹھا ہوں۔ توجہ اور غور سے پڑھتا ہوں۔ شوق میں برابر اضافہ ہوتا ہے۔ مدیر کو مبارکباد ہو!

ڈاکٹر شاہدہ روبینہ ' جھنگ

جو حکمران قوم کو الف بے نہیں پڑھا سکے' انہیں انگریزی پڑھانے کی خوب سوجھی ہے۔ تعلیم میں اصل رکاوٹ حکمران جاگیردار طبقہ ہے۔ پرائمری تعلیم آسان' لازمی اور مفت ہو تو ہماری قوم کے لیے زندگی کے راستے کھلیں۔

محمد انور ملک ' سرگودھا

۱۹۵۰ سے ترجمان القرآن کا قاری ہوں۔ موجودہ معیار نہایت دلاویز اور دلنشیں ہے۔ مضامین کا انتخاب نہایت پیارا اور ایمان افروز ہے۔ اللہ کرے زور علم اور زیادہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عبادت قبول فرمائے اور اسے آپ کے لیے توشہ آخرت بنائے۔

ترجمان ری پرنٹس سروس

۱۔ تحریک اسلامی کارکنوں کے اوصاف	پروفیسر غلام اعظم	مئی ۹۵	۱۳/- روپے
۲۔ نئی صلیبی جنگ: دینی مدارس کے دروازوں پر	خرم مراد	مئی ۹۵	۱۰/- روپے
۳۔ توہین رسالت کا مقدمہ	خرم مراد	اپریل ۹۵	۱۰/- روپے
۴۔ پاک امریکہ تعلقات ـ منظر پس منظر	خرم مراد	اگست ۹۴	۶/- روپے
۵۔ دب کے در پہ	مسلم سجاد	فروری ۹۵	۵/- روپے
۶۔ دہشت گرد کون؟	خرم مراد	جون ۹۵	۱۰/- روپے
۷۔ دینی مدارس کا نظام تعلیم	مختلف علمائے کرام	جولائی ۹۵	۲۵/- روپے
۸۔ آج کا داعی 'کل کا قائد	محمد بشیر جمعہ	جون' جولائی ۹۵	۱۰/- روپے
۹۔ پاکستان کہاں کھڑا ہے؟	خرم مراد	اگست ۹۵	۱۰/- روپے
۱۰۔ فکر مودودی کیا ہے؟	خرم مراد	ستمبر ۹۵	۱۵/- روپے

ٹیم ورک: تعارف اور ضرورت از محمد بشیر جمعہ ترجمان ری پرنٹس کے تحت ۱۵/- روپے سیکڑہ کے حساب سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

۱. کم سے کم ۱۰۰ ری پرنٹس کا آرڈر لازمی ہے۔ کوئی ایک ری پرنٹ ۲۵ سے کم نہ ہو۔
۲. ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہے۔ ادائیگی نقد کیجیے یا وی پی طلب کیجیے

منشورات

ترجمان ری پرنٹس سروس

منصورہ لاہور۔ 54570

REGD. NO. L 5340

PHONE: 7587916 7585590

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE